اسلامی افسانے

نور احمد فریدی

انتساب

علامہ محمد طاہر فاروقی کی کتاب "سیرت اقبال" کے مطالعہ سے معلوم ہوا۔ کہ حکیم الامت علامہ سر محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ اسلامی "تاریخ" کو افسانوی رنگ میں دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ اِس جذبہ نے مجھے اس فن کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ میں نے "تاریخ کی "شراب" کو پہلی بار افسانے کے "رنگین جام" میں پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ اگر علامہ آج زندہ ہوتے۔ تو یہ گلدستہ اُن کی خدمت میں نذر کرتا۔ اب اُن کے نام نامی و اسم گرامی سے منسوب کرتا ہوں ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

جکھووالہ۔ ضلع ملتان
۲۲، ذی الحجہ ۱۳۷۹ھ

خاکسار
نور احمد خاں فریدی

"افسانوں کے نفسیاتی پہلو کے لطف کا میں ضرور قائل ہوں لیکن اگر اُن کی جگہ ایسی شے پیش کی جائے۔ جو افسانے کا افسانہ ہو اور سبق کا سبق۔ تو بہتر ہو گا۔ اسلام کے اولوالعزم فرزند ایسے ایسے کارنامے انجام دے چکے ہیں۔ کہ اُن کا تذکرہ بہتر سے بہتر افسانے سے زیادہ دلچسپ ہے۔ میری مدت سے خواہش ہے۔ کہ کوئی ادیب یا مؤرخ اس سلسلہ کو شروع کرے۔ تاریخ میں اس کے لئے بہت مواد موجود ہے صوفیائے اسلام۔ فلسفیان اسلام، علمائے اسلام، مجاہدین اسلام، شعرائے اسلام وغیرہ ہر عنوان پر ایک دلچسپ تذکرہ ترتیب دیا جا سکتا ہے۔"

"محمد اقبالؒ"

(سیرت اقبال صفحہ ۶۳)

سخن ہائے گفتنی

سُن کر مرا "افسانہ" انہیں لطف آ گیا
سنتا ہوں اب کہ روز طلب قصہ خواں کی ہے

مجھے نہ ڈراما نگاری کا ذوق ہے اور نہ افسانہ نویسی کا شوق۔ میری طبیعت کا رجحان تنقیدی مقالات کی طرف زیادہ ہے اس لئے میں بالعموم ٹھوس علمی مضامین ہی لکھا کرتا ہوں۔ علامہ مرحوم کے ارشاد گرامی نے مجھے "اسلامی افسانے" لکھنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ یہ گلدستہ اس سلسلے کی پہلی قسط ہے۔ احتیاط یہ رہی ہے۔ کہ "افسانویت" حقیقت پر غالب نہ آنے پائے۔ اس میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی۔ اس کا فیصلہ ناظرین کرام پر چھوڑتا ہوں۔ کیونکہ ع

مُشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

یہ میری پہلی کوشش ہے۔ اگر ارباب ذوق نے اسے

پسند کیا۔ تو تاریخ اسلام کے ایسے تمام قابل فخر کارناموں کو جن سے سلاطین اسلام کی سیرت اُجاگر ہو سکتی ہے افسانوی رنگ میں پیش کیا جائے گا۔

سرِدست یہ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ یہ سلسلہ کتنے نمبروں پر جا کر ختم ہو۔ جدید ٹکنیک کے دلدادگان شاید اس مجموعہ کو پسند نہ کریں۔ کیونکہ ان میں ان کی "ضیافتِ طبع" کا کوئی سامان نہیں۔ یہ سلسلہ صرف اُن حضرات کے لئے شروع کیا جا رہا ہے۔ جو "فنِ تاریخ" سے وابستگی رکھتے ہیں۔ اور افسانے کے پودے کو تاریخ کے سایہ میں سرسبز دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ "الف لیلہ" اور "فسانۂ عجائب" کے قارئین کو معلوم رہے۔ کہ یہ افسانے جن کے پیش کرنے کی عزت حاصل کی جا رہی ہے۔ طبعزاد قصے کہانیاں نہیں ہیں۔ بلکہ اسلامی دنیا کے ایسے سنہری کارنامے ہیں۔ جن پر مسلمان جتنا بھی فخر کریں بجا ہے۔ یہ واقعات اب تک تاریخیں اپنی آغوش میں لئے پڑی تھیں۔ میں نے "تخیل" اور "قیاس" کی مدد سے وہ ماحول کھڑا کر دیا ہے۔ جو مؤرخین نے "عدم گنجائش اور "مصلحت وقت" کے تقاضا سے نظرانداز کر دیا

تھا۔ دوسرے معنوں میں یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔ کہ یہ افسانے دراصل وہ "حقائق" ہیں۔ جو تاریخ کی کروٹوں میں دبے پڑے تھے۔ جنہیں میں نے ناظرین کرام کے سامنے توضیحی صورت میں پیش کر دیا۔

پہلا افسانہ "لعل کی چوری" ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کل کے ہندوستانی "آج" کی طرح "اسباب زیست" مہیا کرنے میں اتنا پریشان نہ تھے۔ وہ لوگ سادہ زندگی بسر کرنے کے باوجود لعل شب چراغ سے کھیلا کرتے تھے۔

پان کی گلوری، زنجیر عدل، توزک جہانگیری کا ایک ورق، کوٹ نورنگ کی تباہی اور افیونی راجہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ "عہد وسطیٰ" میں انصاف آج کی طرح مہنگا نہیں تھا۔ فریادی برسر دربار اپنے بادشاہ سے دادخواہ ہو سکتا تھا۔ ملزم خواہ ولی عہد سلطنت ہوتا یا کوئی امیر کبیر۔ اُسے فریادی کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہونا پڑتا۔ اور جو سزا اُسے ملتی وہ عام مجرموں سے زیادہ سنگین ہوتی۔ بادشاہ اپنی رعایا کو اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ اس میں مسلم وغیر مسلم کی کوئی تمیز نہ ہوتی تھی۔ ان کے عدل وانصاف کا آفتاب عالمتاب بلا امتیاز رنگ وملت

ہر کہ ومہ پر برابر ضیا پاش ہوتا تھا۔

قاضی سراج احمد کے تاریخی کارنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے علمائے ماضیہ نہ صرف دینیات کے ماہر تھے۔ بلکہ شعر وشاعری، فلسفہ، طب، ریاضی اور فنون لطیفہ میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ اور موقعہ پر اپنے کمالات سے اس طرح استفادہ کرتے تھے۔ کہ بڑے بڑے کامل الفن اُستاد اُنہیں "جگت گرو" تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ "بابا ہری داس" بھی اُسی قبیل کا افسانہ ہے۔

"میواڑ کی رانی" نے بہادر شاہ کے حملے کی تاب نہ لا کر جب ہمایوں کو پکارا۔ تو وہ محاذ جنگ چھوڑ کر اس کی امداد کو لپکا۔ اس واقعہ سے ہندو مسلم تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ کی لڑائیاں محض ملک گیری کے لئے ہوتی تھیں۔ اگر بہادر شاہ مذہب کے نام پر حملہ کرتا۔ تو ہمایوں سا متقی سلطان ایک ہندو رانی کی خاطر اس سے نہ ٹکراتا۔

عرابتہ الاددسی سے قرون اُولیٰ کے جود وسخا کا اندازہ ہوتا ہے۔ اُس زمانہ کی داد و دہش کا یہ عالم سچ مچ افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

احمد بن الیاس ایک پیرانہ سال وزیر ہے اس نے موت کو جس طرح خوش آمدید کہا۔ اور مرنے کے لئے جس طرح اپنے آپ کو تیار کیا۔ اس پر ہر مسلمان کو رشک آئے گا۔

"باغی پروانے" وفاشعاری اور اسلامی غیرت وحمیت کا حسین مرقع ہے۔ تمباکو سے اُس کے مُضر اثرات کا پتہ چلتا ہے۔

اس وقت جبکہ کتاب کا مسودہ طباعت کی غرض سے پریس میں جارہا ہے۔ قائداعظم محمد علیؒ جناح مدظلہ العالی کی کوششوں سے "پاکستان" کی آزاد اسلامی سلطنت معرض وجود میں آچکی ہے۔ اُمید ہے۔" اسلامی افسانے" کے مطالعہ سے آزاد مسلمان اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر محسوس کرسکیں گے۔

اخیر میں ادب نواز حضرات سے استدعا ہے۔ کہ اگر وہ اس گلدستہ میں کوئی ادبی یا فنّی فروگذاشت پائیں۔ تو اس سے مجھے ضرور آگاہ فرمائیں: تاکہ دوسرے ایڈیشن میں مناسب اصلاح کردی جائے وإلى الله التوفيق خاکسار نور احمد خان فریدی

حلال آدمی کو ہے کھانا نہ پینا
نہ ہو ایک جب تک لہو اور پسینا

تعارف

مصنف کے حالات پر سیر حاصل مقالہ

ماخوذ از "خیام" لاہور یکم مئی ۱۹۴۴ء

مولوی نور احمد خاں فریدی اُن وسیع المطالعہ محققین میں سے ہیں جو علم و تحقیق کی مشعل لے کر تاریخ کی پُرپیچ وادیوں کو اُجاگر کرتے رہتے ہیں۔ اُن کے متعدد تاریخی مقالات خیام و عالمگیر میں شائع ہو کر اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ حضرت مخدوم حافظ سید غلام عباس شاہ صاحب قتالی نے انہی کی عالمانہ و ادیبانہ قابلیتوں پر روشنی ڈالی ہے۔" [اردو خیام لاہور]

"خیام"[۱] کی ہر اشاعت میں ادبی دنیا کسی نہ کسی ادیب سے ضرور متعارف ہوتی ہے۔ اس وقت تک درجنوں اہل قلم

---

[۱] لاہور کا یہ مقبول عام ہفت روزہ اخبار حافظ محمد عالم صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

کے حالات حیطۂ تحریر میں آ چکے ہیں۔ ان میں کئی شاعر ہیں تو کئی افسانہ نگار۔ لیکن مؤرخ کا کالم ابھی تک خالی ہے۔ میں اس کمی کو پورا کرنے کی غرض سے ہندوستان کے مشہور محقق مولانا نور احمد خاں فریدی کے نام نامی کو پیش کرتا ہوں۔ جنہیں فن تاریخ سے وابستگی نہیں بلکہ عشق ہے۔ اور اگر جناب سعدیؒ کے اس قول میں کچھ جان باقی ہے۔ کہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند" تو میں بلا خوف تردید عرض کروں گا۔ کہ قدرت نے اس شخص کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے۔ کہ وہ "فن تاریخ" کی خدمت کرے۔ میرا ممدوح نہ تو ملک کا کوئی لیڈر ہے۔ نہ مقتدر رئیس۔ ایک غریب الحال درویش ہے جو ادبی حلقوں سے کوسوں دور ایک ایسی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ جہاں نہ کوئی کتب خانہ ہے نہ کوئی اہل زبان۔ سال میں وہ ایک بار اپنے گاؤں سے نکلتا ہے۔ اور اپنی بے مائیگی کے باوجود ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں پہنچ کر اپنی علمی تشنگی کو بجھاتا ہے۔ اور پھر سارا سال انہی یادداشتوں کے سہارے اپنے دلچسپ مشغلے کو جاری رکھتا ہے۔ آج تک اس نے جتنے مسودے لکھے۔ اور جتنے مضامین اخبارات اور

مؤرخ اسلام الحاج مولانا نور احمد خان فریدی

مصنف

حجاج بن یوسف، ابن زبیرؓ، سرزمین ملتان
اسلامی افسانے، تاریخی ڈرامے وغیرہ،

رسائل میں چھپوائے۔ اگر انہیں کتابی صورت میں جمع کیا جائے۔ تو کئی ہزار صفحات کو محیط ہوں گے۔ مگر اقتصادی مجبوریوں کے پیشِ نظر نہ تو وہ خود ایسا کر سکا۔ نہ اس کی غیرت اس امر کی مقتضی ہوتی ہے۔ کہ وہ کسی "خداوندِ نعمت کے آگے "دستِ احتیاج" دراز کرے۔ اگر زمانہ موافقت کرتا۔ تو آج یہ باکمال شخص دو اڑھائی سو تصانیف کا مالک ہوتا۔ لیکن وائے حسرتا! ؎

کچھ بلبلوں کو یاد ہیں کچھ قمریوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

"فریدی را برائے وقائع نگاری آفریدہ اند" کا بڑا ثبوت اس کی زندگی کے پر لطف اوراق ہیں جنہیں اگر گوناگون دلچسپیوں کا مرقع کہا جائے۔ تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ قدرت مؤرخ کی تربیت کس طرح کرتی ہے۔

مولانا فریدی ۱۵ ستمبر ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ وطن مالوف جگو والہ ضلع ملتان ہے۔ آپ کے والد ماجد الحاج مولانا امام بخش خان صاحب "بلوچ خاندان" کے ممتاز رکن

ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں آپ کو "مدینہ طیبہ" ہجرت کر جانے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ گھر کا سارا اثاثہ فروخت کر کے ارضِ پاک کو روانہ ہوئے۔ بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا۔ کہ جنگ کے باعث راستہ بند ہے۔ یہیں مولانا فریدی کی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی۔ قرآن ایک بنگالی عالم سے پڑھتے اور مروجہ تعلیم توکریا ہائی سکول سے پاتے۔ چھٹی کے بعد یہ ہونہار طالب علم اپنے چند دوستوں کے ہمراہ سیر کو نکل جاتا۔ دورانِ قیام میں سمندر کے مدوجزر، بندرگاہ، وکٹوریہ ٹرمینس، عجائب گھر اور مالابارہل کا چپہ چپہ چھان مارا۔ جب آگے جانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اور اعزا و اقارب نے واپس آنے پر مجبور کیا۔ تو قبلہ حاجی صاحب اپنے بال بچوں سمیت وطن تشریف لے آئے۔ ۱۹۱۸ء میں حاجی صاحب نے پھر مکہ معظمہ جانے کی تیاری کی۔ رات کو ذکر ہوا۔ کہ اب بچے کو ہمراہ نہیں لے جائیں گے ننھا سیاح جغرافیہ کی کتاب بغل میں دبا پندرہ بیس روپے گھر سے اُٹھا بمبئی کو روانہ ہو گیا۔ اور اب کی دفعہ لاہور۔ بھٹنڈہ۔ ریواڑی۔ جے پور۔ اجمیر۔ مارواڑ۔ احمد آباد اور بمبئی کی خوب سیاحت کی۔ چند ماہ بمبئی میں عبد المومن نامی ایک ترک کے گھر

میں بسر کئے ۔ حاجی صاحب بھی تلاش کرتے کرتے ان کے
پیچھے بمبئی آپہنچے ۔ اور انہیں واپس گھر لے آئے پھر اگرچہ
باقاعدہ طور پر تعلیم پانے لگے ۔ مگر ذوقِ سیاحت ہمیشہ سکول
بدلنے پر مجبور کرتا رہا ۔ بہرکیف انٹرنس اور السنۂ شرقیہ کے
امتحانات پاس کر کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہوئے اور ج وی اور
ایس وی کی ٹریننگ پانے کے بعد مضمون نگاری کی طرف توجہ
دی ۔ پہلا مضمون میرا خواب " نخلستان" ملتان، ۱۹۲۸ء
میں شائع ہوا ۔ یہ مقالہ اس قدر مقبول ہوا ۔ کہ پنجاب کے
اکثر جرائد نے مضامین کے لئے فرمائشی خطوط بھیجے ۱۹۴۰ء
تک فریدی صاحب ملتان کے نزدیکی مدارس میں تعینات
رہے ۔ اس دوران میں انہوں نے ابن زبیرؓ، حجاج بن یوسف
اور سرزمین ملتان کے نام سے تین کتابیں شائع کیں ۔
عرصہ تک اخبار صداقت بھی ان کی ادارت میں نکلتا رہا ۔
الفرید اور گنج شکر کے نام سے دو ماہنامے بھی جاری کئے ۔ جو
بعض ناگزیر کی حالات کی بنا پر بند کرنے پڑے ۔ اس وقت
آپ کے مضامین "صبح امید" عندلیب (بمبئی) نیرنگ خیال،
عالمگیر، نسوانی دنیا، سدا بہار، خیام، ادا کار (لاہور) اردو (دہلی)،

التزکیہ اور ستلج (بہاول پور) میں چھپ رہے ہیں۔ دیوانِ فریدی کے ترجمہ میں بھی انہوں نے بیش از بیش حصہ لیا ہے۔ تھوڑی مدت سے فریدی صاحب افسانہ نویسی کی طرف متوجہ ہیں۔ پان کی گلوری، لعل کی چوری، بابا ہری داس، میواڑ کی رانی، کوٹ نورنگ کا انہدام ان کے شاہکار ہیں۔ "میواڑ کی رانی" کے افسانے کو جناب شبلی بی کام نے اپنی مشہور تالیف "تاریخی رومان" میں دوسرے نمبر پر جگہ دی ہے۔ "اکبر اعظم کی موت" اور "طلاق" کے عنوان سے دو ڈرامے بھی معیاری رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ آجکل "بلوچی دنیا" کے نام سے دنیا کی مشہور قوم "بلوچ" کی جامع تاریخ لکھنے میں مصروف ہیں۔ اگرچہ مولانا فریدی "کثیر الاشواق" اور "جامع الاذواق" واقع ہوئے ہیں۔ مگر "نقدنگاری" اور "تحقیقی مقالات" لکھنے کی قابلیت ان میں "بے تحاشا" ہے۔ ان کی عبارت میں متانت اور سنجیدگی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ کہیں کہیں ان کا انداز بیان اس قدر مہیب ہو جاتا ہے۔ کہ یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے جہنم کا فرشتہ اہل دوزخ سے مخاطب ہے "مشاہیر ادب کی لغزشیں" میں انہوں نے ایسے ایسے "قادر الکلام" ادباء کی گرفت کی

ہے۔ جن کا سکہ دنیا مانتی ہے "ڈراما شاہ جہان پر اک نظر" میں محمد رفیق خاور پر ایسے برسے کہ انہیں جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ حافظ سراج الدین محمود سے بھی خوب جھڑپ ہوئی۔ مگر شبلی صاحب آڑے آگئے۔ اور سلسلہ شروع ہوتے ہوتے رک گیا۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ مولانا فریدی کامیاب ناقد، مؤرخ، ماہر تعلیم، معلّم، واعظ، مصلح اور فاضل ادیب ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے۔ کہ ان کا ماحول ادبیت سے معرّا اور اُن کی صحت، دماغی کام کے ناقابل ہے۔ آئے دن معدے کی بیماریوں کا شکار رہتے ہیں۔ مالی مشکلات اور افسرانِ تعلیم کی ناقدردانی مزید برآں ہے۔ الغرض خواجہ حافظ شیرازی کا یہ شعر اُن پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ ؎

اسپ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالان
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمے بینم

خلیفہ تھے اُمّت کے ایسے نگہباں
ہو گلّہ کا جیسے نگہبان چوپاں

لعل کی چوری

"اے آسمان کے بادشاہ! تو دیکھ رہا ہے، مَیں سلطانِ ہند کے دربار میں دادخواہی کے لئے جارہی ہوں اگر شہنشاہ نے میرا انصاف نہ کیا تو اس کا بدلہ تجھے لینا ہوگا"

"بیتا"

آج سے پانچ سو سال قبل جب اعظم السلاطین سکندر لودھی گوالیار کے فلک بوس اور عجوبۂ روزگار قلعہ کو مسخر کرنے کے بعد اس کے ضبط و نسق میں مصروف تھے اس قلعہ کے نشیب میں مزدوری پیشہ لوگوں کی ایک بستی آباد تھی ۔ جن میں شامو اور پہاڑی دو بھائی رہتے تھے ۔

پہاڑی شامو سے پانچ برس چھوٹا تھا ۔ دونو سگے بھائی تھے ۔ اور آپس میں خوب نبھ رہی تھی ۔ دونو صبح کا ناشتہ کرکے ہمسایوں کے ساتھ پہاڑ کی چکر دار سڑک کو طے کرتے ہوئے شہر میں پہنچتے ۔ اور دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد اپنا نصیبہ لے شام کو گھر لوٹ آتے ۔

محرم ۹۱۳ھ میں دفعتہً سلطان کے قشون قاہرہ کے کوچ کا اعلان ہوا ۔ اور لشکری اپنے اپنے ہتھیاروں کو درست کرنے لگے ۔ بازاروں میں اچھی خاصی رونق ہوگئی ۔ جہاں

کہیں دو چار آدمی جمع ہوتے۔ یہی چرچا شروع ہو جاتا۔

پہاڑی ایک تنومند نوجوان تھا۔ اور بستی میں چلبلے پن کی وجہ سے مشہور تھا۔ اکھاڑے کی اس کے دم سے رونق تھی۔ وہ فطرتاً دلیر واقع ہُوا تھا۔ سپاہیوں کی زبانی جب وہ جنگ وجدل اور لوٹ مار کے قصّے سنتا۔ تو اس کی شریانوں میں بہادری کا خون کھول اُٹھتا۔ اور وہ دل ہی دل میں اپنے اس ذلیل پیشے سے نفرت کرنے لگتا۔ گھر آتا۔ تو کہتا "بھیّا روز روز کی یہ مزدوری ہم سے نہیں کی جاسکتی۔ ہم تو جنگ پر جائیں گے"۔

شامو کہتا نہ بھائی۔ لڑائی پر جانا ہمارا کام نہیں۔ ہم تم تو پتھر ڈھونے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اگر جنگ پر چند پیسوں کے ملنے کی اُمید ہے۔ تو قدم قدم پر جان کا خطرہ بھی ساتھ ہے۔ لیکن پہاڑی پر جو نشہ چڑھ چکا تھا۔ شامو کے سمجھانے بجھانے سے نہ اُترا۔ اور وہ اپنے ارادے پر نہایت مستقل مزاجی سے ڈٹا رہا۔

---

۱۵ محرم کو جب شامو اور پہاڑی سپہر کا کھانا کپڑے میں باندھے پہاڑ کی چڑھائی کاٹ رہے تھے۔ اچانک قلعہ کے

نوبت خانے سے نفیریوں اور قرناؤں کے بجنے کی آواز آئی۔ اور توپوں کی دنادن سے قلعہ کی فضا گونج اٹھی۔ دونو بھائی چلتے چلتے رُک گئے۔ اور غور سے قلعہ کی طرف دیکھنے لگے۔

قلعہ کا فلک رفعت دروازہ بصد شان و شکوہ اتنے بُعد کے باوجود اس قدر صاف نظر آرہا تھا گویا اس کے قدموں میں کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ شہنائیوں اور دماموں کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ اور جنگی سازوں نے وہ سماں باندھ رکھا تھا۔ کہ جوش اور بہادری کا لہو دلوں میں کھولنے لگتا۔ اس ہنگامہ کے ساتھ ساتھ قلعہ کا دروازہ کھلا۔ اور ایک کوہ پیکر ہاتھی نکلا۔ جس پر اژدہا کی شکل کا شاہی نشان ہوا میں فراٹے لے رہا تھا۔ اس کے پیچھے اور ہاتھی نمودار ہوئے۔ ان پر لودھی سلاطین کے مخصوص طبل و علم اور سلطنت ہند کا ماہی مراتب آفتاب کی سنہری کرنوں میں اپنے انعکاسی عمل سے عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ پیچھے چند اور ہاتھی آئے۔ ان پر برنجی اور فولادی نقارے اور دمامے لدے تھے نقارچی فاتحانہ ضربیں بجا رہے تھے۔ شامو نے حیران ہو کر پہاڑی کو دیکھا۔ اور کہا۔ "پہاڑی! ذرا انصاف سے کہنا تمہاری نگاہوں نے کبھی پہلے

بھی اتنا سامان دیکھا ہے؟"

"ہاں بھیّا! سکندر کی سینا ہے کوئی مذاق نہیں!!"

اتنے ہی فوج کے ہاتھی ان کے پاس سے گذرنے لگے۔ جب نوبت خانے کے ہاتھی گذر چکے۔ تو ان کے بعد کئی ہزار ہاتھی عماری اور ہودج سے آراستہ، گلے میں ہیکلیں لٹکائے سونڈوں میں فولادی زنجیر لئے عجیب آن بان اور شان و شوکت سے ان کے قریب آئے۔ ہاتھیوں کے بعد سلطان کی سواری نہایت تزک و احتشام سے گذری۔ بادشاہ پیگو کے سفید ہاتھی پر عجب تمکنت سے سوار تھا۔ اور پیچھے پیچھے وزیر اعظم اور دیگر اراکینِ دربار کے ہاتھی جھومتے جھامتے چلے آتے تھے۔ عقب میں ہزاروں سوار اپنے گھوڑوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے پیادوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ پہاڑی کا دل قابو میں نہ رہا۔ اور بولا بھیّا میں تو جاتا ہوں۔ خدا معلوم شامو کو کیا سوجھی کہ وہ بھی جنگ پر جانے کو آمادہ ہوگیا۔ دونو لپک کر گھر پہنچے۔ اور معمولی زاد راہ ہمراہ لے کر پیادوں کے ساتھ چل دئے۔

سکندری اقبال سے پہاڑ بھی ذرّے بن کر اُڑ گئے۔
ہنونت گڈھ کی سنگین دیواروں کی کیا حقیقت تھی۔ سکندری
جان بازوں نے تلواریں نیام سے نکال، جان کی بازی لگا
قلعے پر ہلّہ بول دیا۔ اور جو مہم مجاہد خاں کی بد دیانتی سے چھ ماہ
کے طویل عرصہ میں سر نہ ہو سکی تھی۔ شہنشاہ کے تشونِ قاہرہ
نے ایک ہی حملہ میں جیت لی۔ اور ہنونت گڈھ کی اینٹ سے
اینٹ بجا دی گئی۔ عین اس وقت جبکہ شاہی فوج شہر کے لوٹنے
میں مصروف تھی۔ شامو اور پہاڑی نے بھی دار و گیر کے اِس
ہنگامہ میں ایک سیٹھ کے مکان پر چھاپہ جا مارا۔ اور چوہوں کی
طرح دبے پاؤں اشرفیوں کی چند تھیلیاں اور چند ریشمی پارچات
اُڑا آنکھ بچا کر باہر نکل آئے۔ دونو دیر تک چپ چاپ چلتے رہے
جب پرانے کھنڈر کے پاس پہنچے۔ تو ایک شکستہ دیوار کے ساتھ
دبک کر بیٹھ گئے۔ پہاڑی نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔
لو بھائی جو کچھ ملا ہے۔ اسے یہیں بانٹ لیں۔ شامو نے
پتھر کی ایک بڑی سِل پر تھیلیوں کو اُلٹ دیا۔ اشرفیوں
کی جگمگاہٹ سے کھنڈر بھی چمک اُٹھا۔ پہاڑی نے اشرفیوں
کو انگلیوں سے کریدا۔ دو لعل بے بہا جگمگ جگمگ کرتے

ہوئے نکل آئے ۔ دونو بھائیوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں ۔ شامو نے فوراً دونو ہاتھوں سے ڈھانپ دیا ۔ اور پہاڑی کو کہنی مارتے ہوئے آہستگی سے کہا ۔ ہماری قسمت جاگ اُٹھی ۔ دونو قیمتی لعل معلوم ہوتے ہیں ۔ چھپا لو ان کو ممکن ہے ہماری طرح کوئی اور بھی اس کھنڈر میں موجود ہو ۔

پہاڑی نے جلدی سے اشرفیوں کے دو حصے کر ڈالے ۔ شامو نے ایک حصہ اُٹھا کر تھیلی میں ڈال لیا ۔ اور اپنے حصے کا ایک لعل بھی لے لیا ۔

دونو نے تھیلیوں کو کس کر کمر سے باندھ لیا ۔ اور واپس کیمپ کو روانہ ہوئے ۔ پہاڑی نے کہا ۔ شامو بھائی ! ہماری زندگی کے لئے اتنا کچھ کافی ہے ۔ چلو اب وطن کو لوٹ چلیں اور باقی زندگی عیش و آرام سے بسر کریں ۔" شامو نے ایک زہر خند قہقہہ لگایا ۔ اور کہا

"بس اسی لئے مجھے تنگ کرتے تھے ۔ اب اگر آچکے ہو ۔ تو چند سے اور فوج میں رہ کر اپنی بہادری کے جوہر دکھاؤ ۔ کیا عجب کہ سلطان کی نظر پڑ جائے ۔ اور تمہیں کسی اچھے عہدے پر لگا دے ۔"

"نہ بھائی مجھے اتنا کافی ہے۔ زیادہ حرص آدمی کو خراب کرتی ہے۔ میں تو اب گھر جاؤں گا۔ گوالیار کا پرشکوہ قلعہ حسین پہاڑی لالہ اور نندو کی دوستی اور سب سے بڑھ کر اپنا وہ پیارا پیارا جھونپڑا۔ کیا یہ کوئی بھلانے کی چیزیں ہیں!

جس وقت شامو نے دیکھا۔ کہ پہاڑی واپس جانے پر مصر ہے۔ تو اس نے اور اصرار مناسب نہ سمجھا۔ اور اپنا مال بھی اس کے حوالے کیا۔ اور کہا یہ چیزیں میرے گھر میں دے دینا"! دونو بھائی ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر ملے۔ شامو نے بال بچوں کی خبر گیری اور گھر کی نگرانی وغیرہ کی ہدایت کر کے پہاڑی کو رخصت کر دیا۔

شامو دو برس تک افواج شاہی کے ساتھ ساتھ لکھنوتی کے اطراف میں پھرتا رہا۔ لیکن چونکہ حملے سے پہلے راجے مہاراجے سلطان کی اطاعت کر لیتے تھے۔ اس لئے کسی جگہ بھی لوٹ مار کی اجازت نہ ملی۔ اس لئے شامو معمولی سامان کے ساتھ گوالیار کو واپس ہوا۔ اور آتے ہی بیوی سے اپنی امانت کا مطالبہ کیا۔

"بینا" شامو کی نیک بخت بیوی تھی۔ اس غریب نے اتنا عرصہ نہایت کفایت شعاری سے گذارا تھا۔ اس نے تفصیل سے بتایا۔ کہ اتنے روپے بال بچوں کی خوراک پر خرچ ہوئے۔ اتنے کے ہم نے کپڑے خریدے۔ باقی یہ اشرفیاں جوں کی توں رکھی ہیں "

شامو نے فکرمند ہو کر "اچھا خیر۔ یہ تو درست ہوا۔ مگر وہ لعل کہاں ہے ؟"

"لعل کون سا! میں نے تو لعل وال کچھ نہیں دیکھا" بینا نے گھبرا کر جواب دیا۔

شامو کی آنکھیں غصہ سے لال پیلی ہو گئیں۔ وہ چمک کر بولا "کیا پہاڑی نے تمہیں لعل نہیں دیا؟"

"بالکل نہیں!"

شامو گھبرا اٹھا۔ آواز دے کر بھائی کو بلایا "پہاڑی بھیا! پہاڑی بھیا!!"

پہاڑی چھری سے رسی کاٹ رہا تھا۔ چھری وہیں پھینک آہستہ آہستہ شامو کے پاس آیا۔

"میرا لعل کہاں ہے ؟ شامو نے پریشانی کے عالم میں

چھوٹتے ہی سوال کیا۔
"لعل؛ وہ تو میں نے آتے ہی بھاوجہ کے حوالے کر دیا تھا۔"
یہ سن کر بینا باہر نکل آئی۔ اور سراسیمگی کی حالت میں بولی۔
"پہاڑی بھیّا! کیا کہہ رہے ہو۔ لعل اور مجھے؟"
"اس وقت تو خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔ اور ہر جگہ اُچھالتی پھرتی تھی۔ اب کہتی ہے کیسا لعل! گویا کچھ جانتی بھی نہیں!!"
ہائے بھگوان! اب میں کیا کروں" شدت غم سے بینا ٹھہر نہ سکی۔ اور روتی ہوئی کوٹھری میں چلی گئی۔
شامو بیچارہ تذبذب میں تھا۔ کہ پہاڑی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا" عورت ذات سے خدا بچائے۔ کس طرح منہ پر جھٹ مکر گئی ہے۔ شامو بھائی! سیدھے ہاتھ کام نہ چلے گا۔ ذرا آنکھیں دکھاؤ۔ لعل گھر ہی میں ہے۔ کہاں جا سکتا ہے؟
یہ کہہ پھر چھُری لے اپنے کام میں لگ گیا۔
"بینا" کمرے میں چارپائی پر پڑی سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ شامو نے اُسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ اور کہا

"پربھو کی ماں! ہزاروں لاکھوں کی چیز ہے تمہارے رونے دھونے سے وہ ہضم نہیں ہو سکتی۔ بہتر ہے کہ واپس کر دو۔ ورنہ میں بُری طرح پیش آؤں گا"

بینا نے جب شوہر کے تیور بدلے دیکھے اور کوئی صورت بچاؤ کی نظر نہ آئی تو عورت ذات ہو کر مردانہ وار جواب دیا۔ کہ رات کی مہلت دے دو صبح کو حاضر کر دوں گی۔ اس پر معاملہ دوسرے دن پر ملتوی ہو گیا۔

اس رات بینا کو فکر سے ایک لحظہ بھی نیند نہ آئی۔ سوچتے سوچتے صبح کر دی۔ اور بڑے سوچ بچار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی۔ کہ اس شر سے بچنے کے لئے عدالت کی پناہ پکڑنی چاہیئے۔ چنانچہ صبح سویرے ہاتھ منہ دھو صاف ستھرا لباس پہن شہر کو روانہ ہو گئی۔

سردی کا موسم، کہر چھائی ہوئی تھی۔ بدن ٹھٹھر رہا تھا۔ اکثر لوگ صبح کی نماز پڑھ کر گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ اور کئی صبح کی سیر کے لئے گھروں سے نکل کر باہر جا رہے تھے۔ بینا اس عالم میں عدالت عالیہ کے برآمدے میں دبکی کھڑی

تھی۔ ایک شریف آدمی پاس سے گذرا۔ بینا نے گلوگیر آواز میں بلا کر پوچھا "بھلے آدمی! تمہیں کچھ پتہ ہے۔ کہ میر عدل (چیف جسٹس) کس وقت آیا کرتے ہیں؟"

"پہر دن کو ــــــ!"

"میں نے ان سے ضروری ملنا تھا"

تو پھر ان کے ہاں گھر میں چلی جاؤ۔ وہ بہت نیک آدمی ہیں۔ ہر شخص سے بااخلاق پیش آتے ہیں"

"میں نے ان کا گھر دیکھا ہوتا۔ تو یہاں کیوں آتی!"

"وہ چوک کے دائیں طرف جو بڑا محل نظر آتا ہے یہی گوالیار کے میر عدل میاں بھورہ صاحب کا مکان ہے"

یہ سن کر بینا اُدھر کو روانہ ہوئی۔ اگرچہ دربانوں نے ٹوکا کہ یہ میاں صاحب کے اوراد و وظائف کا وقت ہے۔ مگر وہ تیر کی طرح اندر چلی گئی۔ میاں بھورہ صاحب، سفید ریش، پچاس برس کی عمر مصلے پر بیٹھے اوراد و اذکار میں مصروف تھے۔ اُسے دیکھ کر ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور فرمایا ہوں ــــــ! یعنی حال بیان کرو؟

ستم رسیدہ بینا نے سارا واقعہ من و عن بیان کیا۔ میاں صاحب

نے وظائف سے فارغ ہو کر فوراً اپنا پیادہ دوڑایا ۔ کہ اس کے شوہر اور دیور کو بلا کر عدالت میں حاضر کریں ۔ بینا کو تسلی دی اور گھر میں اُس کے کھانے کا حکم دے کر عدالت کی تیاری میں مصروف ہو گئے ۔

پہر دن چڑھے عدالت گاہ میں بینا کی طلبی ہوئی ۔ اس اثنا میں شامو اور پہاڑی بھی آ گئے تھے ۔ میاں بھورہ نے فرداً فرداً بینا اور اس کے شوہر کے بیانات قلمبند کئے ۔ اور پھر پہاڑی سے سوالات کرنے شروع کئے ۔ اس نے ہر طرح سے عدالت کو تسلی دلائی ۔ کہ وہ لعل اپنی بھاوجہ کو دے چکا ہے ۔

میاں بھورہ نے پوچھا" اس واقعہ کے گواہ ہیں؟"

"جی ہاں"

"کتنے ـــــ؟"

"دو برہمن"

حاضر کرو ۔

پہاڑی لپک کر قمار خانے میں پہنچا اور دو قمار باز برہمنوں

کو کچھ دے دلا کر اپنی منشا کے مطابق گواہی دینے پر رضامند کر لیا۔
چنانچہ وہ دونو عدالت میں آئے۔ اور حلفیہ بیان دیا کہ پہاڑی نے
ہماری موجودگی میں ہی "بینا" کو لعل دیا تھا۔
میاں بھورہ نے بینا کی طرف مخاطب ہو کر کہا "افسوس کہ
عدالت تمہیں بے قصور ثابت نہیں کر سکتی۔ شاموسے فرمایا۔
کہ "تم اپنی بیوی سے لعل حاصل کر سکتے ہو"
حیرت سے بینا کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئیں۔ اور دنیا اُسے
اندھیر معلوم ہونے لگی۔ ایک دلسوز آہ کھینچی۔ اور مرتعش آواز
سے کہا "کیا آپ کا انصاف یہی ہے؟" اور یہ کہہ کر دم بخود
کمرے سے باہر نکل آئی۔
لوگوں نے جو اس موقعہ پر عدالت گاہ کے باہر جمع ہو گئے
تھے۔ بینا کو مشورہ دیا۔ کہ خوش قسمتی سے سلطان آج کل یہیں
ہے۔ اس کی بارگاہ میں جا کر فریاد کر۔ یقیناً انصاف ہوگا"
"ہاں میں اپنے دُکھ کی فریاد شہنشاہ کے پاس لے کر جاؤں گی"۔
بینا نے قلعے کا رُخ کیا۔ اور آسمان کی جانب نظر اُٹھا کر رقت بھری
آواز سے کہا "اے آسمان کے بادشاہ تو دیکھ رہا ہے۔ میں
سلطانِ ہند کے دربار میں دادخواہی کے لئے جا رہی ہوں۔

اگر شہنشاہ نے میرا انصاف نہ کیا۔ تو اس کا بدلہ تجھے لینا ہوگا"
بنیا بے دھڑک بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ دیوان عام کا
دروازہ آگیا۔

اعظم السلاطین سکندر ثانی شہنشاہ ہند شاہانہ شوکت و
اجلال سے تخت پر بیٹھا ضروری کاغذات دیکھ رہا تھا۔ چوبدار
نے داخل ہو کر عرض کی " عالم پناہ ایک ہندو دیوی دروازے
پر کھڑی ہے۔ اور باریابی کی اجازت چاہتی ہے "
" اُسے ہمارے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت ہے "
سلطان نے نظر اُٹھا کر چوبدار سے خطاب کیا۔
چوبدار کورنش بجا لا کر باہر نکل گیا۔ چند لمحات کے بعد بنیا
دربار میں داخل ہوئی۔ شرم و حیا سے نگاہیں زمین پر جم رہی
تھیں۔ اور رعب شاہی سے قدم سُوسُو من کے ہو رہے تھے۔
سلطان نے بڑی نرمی سے فرمایا۔ بہن! کہو۔ میں تمہاری
کیا مدد کر سکتا ہوں "
جہاں پناہ! میری زندگی خطرے میں ہے۔ میں مہاراج
کی حمایت میں اپنی جان بچانے آئی ہوں ——— لوگوں

سے سُنا ہے۔ کہ آپ رعایا کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے ہیں ۔"
یہ کہہ کر بینا زار زار رونے لگی ۔

سلطان نے دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ کہا۔ "بدولت تمہاری درد بھری کہانی کو تفصیل سے سننا چاہتے ہیں ۔ بول تجھے کیا دُکھ پہنچا ہے ؟"

بینا نے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ جواب دیا ۔
" عالم پناہ ! دو سال کا عرصہ گذرا ۔ میرے شوہر نے سفر سے میرے دیور کے ہاتھ لعل بھیجا ....
کہ میرے گھر میں دے دینا ۔ لیکن اُس نے بد دیانتی کی ۔ اور لعل کا یہاں ذکر تک نہ کیا ۔" شدّتِ غم سے بینا کے آنسو گرنے لگے ۔ گلوگیر ہو کر بولی " اب وہ مجھے چوری کا الزام دیتے ہیں ۔ اے بادشاہ تیرے راج میں مَیں مفت میں ماری جارہی ہوں ۔"

سلطان نے کہا " درست ہے ۔ مگر تجھے ہمارے میرِ عدل میاں بھورا کے حضور میں پیش ہونا چاہئے تھا !"
میں وہاں حاضر ہوئی تھی ۔ مگر افسوس ہے کہ آپ کے میرِ عدل نے مجھ سے انصاف نہیں کیا ۔ پہاڑی کے جھوٹے

گواہوں کے فریب میں آکر فیصلہ میرے خلاف کیا ہے۔ اے راجن! بتا میں لعل کہاں سے پیدا کردں جبکہ میں نے اسے دیکھا ہی نہیں۔

سلطان نے اُسی وقت حکم دیا۔ کہ" ہمارے میر عدل اور مظلومہ کے شوہر اور دیور کو دربار میں حاضر کیا جائے!"

ہرکارے دوڑے گئے۔ اور چشم زدن میں میر عدل شامو، پہاڑی اور ان کے گواہوں کو دربار میں لا حاضر کیا۔ میاں بھورا کو تو بادشاہ نے تخت کے قریب جگہ دی۔ اور افرادِ مقدمہ کے لئے حکم ہوا۔ کہ" باری باری طلبی پر پیش ہوں"

سب سے پہلے شامو طلب کیا گیا۔ جہاں پناہ نے تھوڑی سی موم اُس کے آگے رکھ دی۔ فرمایا تم نے جو لعل پہاڑی کو گھر پہنچانے کے لئے دیا تھا۔ اس کی ہیئت بنا کر پیش کرو۔

شامو نے تھوڑی سی دیر میں لعل کی ہیئت تیار کر دی۔ پھر پہاڑی حاضر ہوا۔ اس نے بھی اشارہ پا کر لعل کی شکل و صورت میں موم کو ڈھال کر پیش کیا۔ ان کے بعد دونو برہمن طلب ہوئے۔ انہوں نے شاہی فرمان پر لعل تو بنائے۔ مگر بے ڈھنگے۔ شکلیں آپس میں ملتی نہ تھیں۔ بادشاہ نے

ان کو بھی چھپا کر رکھ دیا۔ پھر بینا پیش ہوئی۔ سلطان نے اُسے بھی لعل بنانے کا حکم دیا۔ بینا نے دست بستہ عرض کی۔ کہ لونڈی نے جس چیز کو آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اس کی شکل کیسے تیار کر سکتی ہے!"

"کیا تو لعل کی ہیئت تیار نہیں کر سکتی؟" سلطان نے ڈانٹ کر کہا۔

میں کیسے بناؤں راجن۔ میں نے تو اُسے دیکھا ہی نہیں۔ اگر ان آنکھوں نے دیکھا ہو تو اندھی ہو جائیں۔ اگر میرے ہاتھوں نے اُسے چھوا ہو۔ تو ان میں کیڑے پڑیں۔" گواہ پیش ہوں"۔ سلطان نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

دونو جواری ڈرتے ڈرتے پیش ہوئے۔ سلطان نے اُن پر غضب آلود نگاہوں سے نظر کی۔ اور فرمایا۔

"دیکھو! تم اپنے بادشاہ کے حضور میں پیش ہو۔ جو خدا کی طرف سے تمہاری جان اور مال کا محافظ ہے سچ سچ کہو۔ کیا معاملہ ہے۔ ورنہ ذلت سے مارے جاؤ گے"۔

برہمنوں پر رعبِ شاہی سے لرزہ طاری ہو گیا۔ زبان نے یاوری نہ کی۔ دائیں بائیں بغلیں جھانکنے لگے۔ سلطان کی

گرج سے دیوانِ عام گونج اُٹھا۔ چیخ کر کہا۔

" بدبختو! کیا تم یہ سمجھتے ہو۔ کہ ابھی تک بادشاہ پر تمہاری سیہ کاری کا راز فاش نہیں ہُوا؟" لودیکھو!

یہ کہہ کر سلطان نے لعل کی تمام ہئیتیں تخت کے روبرو رکھ دیں اور اہل دربار سے خطاب کرکے فرمایا۔

حضرات! دیکھئے۔ یہ ہئیتیں شامو اور پہاڑی کی بنائی ہوئی ہیں۔ آپس میں کس قدر مشابہت رکھتی ہیں! دراصل لعل کی یہ اصلی ہیئت ہے " پھر گواہوں کی بنائی ہوئی شکلیں پیش کرکے فرمایا۔ اب گواہوں کی بنائی ہوئی شکلیں دیکھئے ۔ یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ لعل کس شکل وصورت کا ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے ۔ کہ یہ دونو جھوٹے گواہ ہیں۔ اور پہاڑی نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے انہیں پیش کیا ہے "

سلطان نے دوبارہ پہاڑی اور اس کے گواہوں پر آتش بار نظر ڈالی۔ جس پر خوف سے ان پر سکتہ کی حالت طاری ہوگئی ۔ اور موت کا نقشہ ان کی نگاہوں میں پھرنے لگا۔ تینوں ملزم تخت کے آگے جُھک گئے ۔ اور اپنے جرم

کا اعتراف کرتے ہوئے معافی کے طالب ہوئے۔ نگران کی اس درخواست نے بادشاہ کے دل پر کچھ اثر نہ کیا۔ سلطان نے انہیں گھور کر دیکھا۔ کہا۔

"تمہیں معافی کیسے دی جا سکتی ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ مظلومہ ہمارے دربار تک نہ پہنچتی۔ تو خدا معلوم اس کا ظالم شوہر اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا"

فرمان ہُوا۔ کہ پہاڑی سے لعل حاصل کر کے شناسو کو دلایا جائے۔ اور اس بددیانتی کے جرم میں اُسے دو سال اور گواہوں کو چھ چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دی جائے۔ پولیس نے اُسی وقت مجرموں کو اپنی حراست میں لے لیا۔ اور سلطان نے بینا کو محض اس خیال سے کہ میری سلطنت میں اُسے مفت کی تکلیف ہوئی۔ قیمتی مال امرحمت کر کے ہمدردی اور دلسوزی سے رخصت کیا۔ میاں بھورہ کو ہدایت ہوئی۔ کہ آئندہ مقدمہ کی کُنہ تک پہنچنے کے لئے کافی تدبر اور تفکر سے کام لیا کریں۔

سمجھتے تھے ذمی و مسلم کو یکساں

پان کی گلوری

"شیر شاہ کی نظر میں معمولی بنیا ہو یا ولیعہد سلطنت عادل، دونو کی عورتیں برابر ہیں اگر بنئیے کی بے عزتی کرتے ہوئے عادل کو شرم نہیں آئی۔ تو شیر شاہ بھی اپنی بہو کی بے حرمتی برداشت کر سکتا ہے۔"

"شیر شاہ سوری"

(۱)

آگرہ کے جاہ وجلال کا زمانہ تھا - دارالخلافہ ہونے کے سبب
نہ صرف شہر کی وسعت اور رونق منتہائے کمال کو پہنچی ہوئی تھی -
بلکہ ہندوستان بھر کے راجاؤں اور امیروں نے بھی جمنا کے کنارے
دُور دُور تک عالیشان کوٹھیوں کا سلسلہ قائم کر دیا تھا - بابری محلّات
اور باغات نے اس "خطۂ ارضی" کو بہشت بریں کا نمونہ بنا دیا تھا
اگرچہ اس وقت تخت سلطنت پر سلطان المعظم شیر شاہ سوری
رونق افروز تھے - اور اگر وہ چاہتے - تو مغل عمارات منہدم کر کے
ان کا نام و نشان تک مٹا دیتے مگر انہوں نے ایسا نہ کیا - کیونکہ
وہ محض رقابتی جوش میں ایسی حسین عمارات کو ضائع کرنا نہ چاہتے
تھے - جو ایرانی اور افغانی آرٹ کا بے مثل نمونہ تھیں - بلکہ انہوں
نے ان باغات اور محلّات میں مرمریں عمارات کا مزید اضافہ کیا -
رعایا کی سہولت کے لئے آگرہ سے بنگال - پشاور - جودھ پور -
چتوڑ اور ملتان تک بڑی وسیع اور پختہ سڑکیں تعمیر کرائیں - اور

ان کے دونو اطراف میں آم اور کھرنی کے درخت لگوائے۔ کہ مسافروں پر "سفر" "حضر" بن گیا۔ پشاور سے بنگال تک لوگ ان درختوں کے سایہ سایہ چلے جاتے۔ معلوم یوں ہوتا کہ گویا وہ کسی باغ کی گلگشت کر رہے ہیں۔ مزید برآں سڑکوں پر دو دو کوس کے فاصلہ سے ایک ایک سرائے تعمیر کرا دی تھی۔ ہر سرائے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے الگ الگ لنگر خانہ قائم تھا۔ جس وقت شہنشاہ دستر خوان پر بیٹھتا۔ نقارے پر چوٹ پڑتی۔ اور اس کی آواز کو سن کر سراؤں کے نقارچی نوبت بجاتے اور ایک ساتھ ہی لنگر تقسیم ہونا شروع ہوتا۔ چنانچہ آدھ گھنٹہ کے اندر ہی اندر بنگال سے پشاور اور ملتان سے چتوڑ تک کے رہ نورد اپنے بادشاہ کیساتھ کھانا کھا لیتے۔ انتظام کا یہ عالم تھا۔ کہ ایک بڑھیا زر و جواہر کا تھال سر پر اٹھائے جہاں چاہتی لئے پھرتی۔ کیا مجال کہ چور کی نیت میں فرق تک آنے پائے۔ ڈاک کا یہ حال تھا۔ کہ بنگال یا پشاور میں کوئی واردات ہوتی تو دوسرے دن بادشاہ کے نوٹس میں آجاتی۔ غرض ان انتظاموں اور سہولتوں سے آگرہ کی رونق میں چار چاند لگ گئے۔ ہر طرف مرفہ الحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا اور جمنا کے لیل و نہار ا تتے

حسین و جمیل تھے۔ کہ نیل اور دجلہ کو یہ ایام خواب میں بھی نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔ اور آگرہ کے بازاروں اور گلی کوچوں میں وہ چہل پہل رہتی۔ کہ بغداد اور مصر بھی اس کے آگے گرد تھے۔

انہی ایام میں ایک روز شہنشاہ کا ولیعہد محمد عادل خاں اپنے جلو سمیت ہاتھی پر سوار ہوکر آگرہ کے ایک کوچہ سے گذر رہا تھا۔ کہ راستے میں ایک کچے مکان کے اندر ایک ہندو عورت بے تکلف غسل کرتی نظر آئی۔ شہزادہ اس وقت پان سے شغل کرتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک گلوری اس عورت پر بھی پھینک دی۔ اور سواری گذر کر چلی گئی۔

عورت شرم و حیا کی دیوی تھی۔ اُسے برہنگی کے عالم میں جب شہزادے کی اس حرکت کا علم ہُوا۔ تو وہ شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ اور بدحواس ہوکر خودکشی پر آمادہ ہوگئی۔ اتنے میں اس کا شوہر ہری بھی آگیا۔ اس نے رو رو کر سارا ماجرا کہہ سنایا۔

پہلے تو اُسے یقین نہ آیا۔ کہ شیر شاہ عادل کا فرزند ہوکر ایسی نازیبا حرکت کا ارتکاب کرے۔ مگر جب ہمسایوں کی زبانی اُسے علم ہُوا۔ کہ واقعی شہزادے کی ہی سواری ادھر سے

گذری ہے ۔ تو وہ غیرت سے تڑپ اُٹھا ۔ اور شہزادے سے انتقام لینے پر آمادہ ہو گیا ۔

بیوی کو جو فورِ غم سے نڈھال ہو رہی تھی ۔ تسلی دی اور کہا " ہمارا شہنشاہ بے حد منصف مزاج اور عادل ہے ۔ اگرچہ عادل خاں اس کا لڑکا ہے ۔ مگر مجھے پختہ یقین ہے ۔ کہ وہ کسی صورت بھی اس کی اس نامناسب حرکت کو گوارہ نہ کرے گا ۔ اس لئے یہ معاملہ بادشاہ تک پہنچانا چاہیئے چنانچہ ہرّی نے ساری رات اُسی غور و فکر میں بسر کر دی ۔ کہ اس مقدمے کو کس طریقے سے شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا جائے ۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا ۔ کہ جب شہزادے نے میری بے عزتی کرتے ہوئے کسی قسم کا شرم و حیا نہیں کیا تو مجھے بھی موقعہ اور مصلحت دیکھنے کی ضرورت نہیں بھرِ دربار اُسے ذلیل کرنا چاہیئے ۔ دوسرے دن صبح سویرے اشنان کر؛ اپنی شادی کے کپڑے پہن ہرّی قلعے کو روانہ ہو گیا ۔

شہنشاہ کا معمول تھا کہ ہر روز بلا ناغہ دیوانِ عام میں اجلاس فرماتے تھے ۔ اور ہر خاص و عام کو دربار کی روئیداد دیکھنے

کی اجازت تھی۔ قلعہ کے پھاٹک پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔
اس لئے فریادی بلا تکلیف دیوان عام میں پہنچ کر بادشاہ سے
بالمشافہ عرض معروض کر سکتے تھے۔ لہٰذا ہری کو بھی دربار
میں باریاب ہونے کے لئے کوئی خاص دقت نہ ہوئی۔ اور
وہ دروازے سے گذر کر بے خوف و خطر آگے بڑھتا چلا گیا۔
دائیں بائیں رومی اور ایرانی باجے بج رہے تھے۔ اور روشن
چوکی کی سہاونی آواز نوبت کی ٹکور سے دل بے قابو ہوا جاتا
تھا۔ ہزاروں سوار اور پیادے رنگدار وردیاں پہنے اور
خون آشام تلواریں علم کئے جابجا پہرے پر استادہ تھے۔

دیوان عام درباریوں اور جان سپار فوجی لوگوں سے
کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مگر چاروں طرف سکوت طاری اور
رعب و خاموشی چھائی تھی۔ رہ رہ کر نقیب کی پرجلال پکار
اور چاؤش کی پرہیبت صدا گونج اٹھتی تھی۔ تسلیمات۔ کورنش۔
بندگی۔ مجرا۔ آداب بجالاؤ۔ نظر روبرو۔ جہاں پناہ بادشاہ سلامت۔
عالم پناہ۔ بادشاہ سلامت۔

اس آواز سے ہری کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور
مارے ہیبت کے تھر تھر کانپنے لگا۔ سامنے نگاہ اٹھائی

تو عجب عالم نظر آیا۔ دیکھا کہ ایک پیر مرد نورانی شکل کے ساتھ لاکھوں روپے کا قیمتی لباس پہنے اور ہیروں کا تاج سر پر دھرے عجیب متانت سے فریادیوں کی دادرسی کر رہا ہے۔

ہری کی قوت گویائی نے یاوری نہ کی۔ دائیں جانب نظر دوڑائی۔ تو بڑے بڑے راجے مہاراجے اور شہزادے ہاتھ باندھے سناٹے کے عالم میں گردن جھکائے نظر آئے۔ بائیں جانب نگاہ کی تو ناظر چوبدار سونے چاندی کے عصا تھامے نظر پڑے۔ ہری نگاہِ حیرت سے اس نظارہ کو دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک چوبدار کی آواز نے چوکنا کر دیا۔

"کیوں بھائی! جہاں پناہ سے کچھ عرض کرنا ہے؟"

"ہاں حضور! میں شہنشاہ کی خدمت ہی میں فریاد لے کر آیا ہوں۔"

"تب ادھر آؤ!"

یہ کہہ کر چوبدار ہری کو فریادیوں کے جرگہ میں لے آیا۔ باری باری ایک ایک فریادی بادشاہ کی خدمت میں پیش ہو رہا تھا۔ جہاں پناہ خود بیان سماعت فرماتے۔ اور ایسا فیصلہ صادر کرتے کہ فریادی کا دل شاد و بہار ہو جاتا۔

ہری جان بوجھ کر پیچھے ہٹا کھڑا رہا۔ کیونکہ اس کا معاملہ ہی کچھ ایسا تھا۔ کہ اس کے لئے شہنشاہ کی کامل توجہ درکار تھی چنانچہ اخیر میں وزیر اعظم نے اسے بھی گذارش کرنے کے لئے تخت کے روبرو لا کھڑا کیا۔ ہری نے شہنشاہ کے باوقار اور پُر جلال چہرہ کو دیکھا۔ تو تعظیم کے لئے جُھک گیا۔ اور تخت کی زمین کو بوسہ دینے کے بعد پان کی گلوری وزیر اعظم کے آگے رکھ دی۔

وزیر اعظم نے بعینہٖ اُسے اُٹھا کر شہنشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بادشاہ نے تعجب سے گلوری کو دیکھا۔ اور فرمایا۔

بیٹا! کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" ہری رعب شاہی سے لرز اُٹھا۔ اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا

"مائی باپ! اور پھر اس کی زبان بند ہو گئی۔

"ہاں! ٹھیک ہے۔ بادشاہ رعایا کا باپ ہی تو ہوتا ہے۔ بولو۔ ڈرو نہیں۔ یہ گلوری کیسی ہے۔ اور اس کے پیش کرنے سے تمہارا کیا مدعا ہے؟"

"ہری" سنبھلا اور سنبھل کر نہایت مرتعش آواز میں بولا عزت کا معاملہ ہے۔ اور عزت ہر ایک کو پیاری ہے۔ عالم پناہ!!

"کیوں! کسی ظالم نے تمہاری عزت پر حملہ کیا ہے؟ بتاؤ! وہ کون مردود ہے؟ شیر شاہ نے گھور کر کہا"۔

جہاں پناہ کا اقبال قائم رہے۔ نام لینے میں ادب مانع ہے۔

ہری نے ادب سے سینہ پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔

"پرواہ نہیں۔ شیر شاہ کی نگاہ میں اراکین شاہی سے معمولی خدام تک سب برابر ہیں۔ اگر تم سچے ہو تو ملزم کو قرار واقعی سزا ملے گی۔

"حضور والا! اس سائل کا ملزم جہاں پناہ کا ولیعہد شہزادہ عادل خاں ہے۔

"عادل! کیا کیا اُس نے؟"!

بادشاہ نے تیوریوں پر بل چڑھاتے ہوئے کہا۔

ظل اللہ! میری بیوی اپنے مکان کے صحن میں نہا رہی تھی۔ پاس سے شہزادے کی سواری گذری۔ ہاتھی پر سوار تو تھے ہی۔ مکان میں نگاہ پڑ گئی۔ حضور کی لونڈی کو جو دیکھا۔ پان کی یہ گلوری پھینک دی۔ عالیجاہا۔ شرم و حیا کی وہ دیوی کل سے زار زار رو رہی ہے۔ شرم سے خودکشی کرنا چاہتی تھی۔ کہ

میں نے بڑھ کر روکا - اور یہ گلوری حضور کی خدمت میں لے آیا - طالب انصاف ہوں -

ہری کے اس بیان کی سماعت سے بادشاہ کی آنکھیں شعلہ جوالہ بن گئیں -

" عادل کو حاضر کرو "! بادشاہ نے حکم فرمایا

دربار میں ایک سناٹا چھا گیا - ملازمین شاہی نے کل کی پتلی کی طرح حکم کی تعمیل کی - اور شہزادہ ڈرتے کانپتے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا

بادشاہ نے شہزادے کے چہرے پر غصہ بار نظروں کو گاڑ کر کہا کیا تمہیں اس وقت حاضر دربار ہونے کی وجہ معلوم ہے ؟ اگر نہیں تو سُن - تمہیں اس لئے طلب کیا گیا ہے کہ تیری زبان سے اپنی محبوب رعایا کی بے عزتی اور بے حرمتی کا واقعہ سنوں - تو اس وقت شیر شاہ کا فرزند نہیں بلکہ قوم اور ملت کا ملزم ہے - قبل اس کے کہ ما بدولت تمہیں عبرتناک سزا دیں - بول تو عذر میں کیا پیش کرنا چاہتا ہے ؟"

عادل خاں سر سے پاؤں تک کانپنے لگا - مگر جلد حواس جمع کر کے سنبھلا - اور سنبھل کر بولا -

عالم پناہ! یہ غلام کسی ایسے فعل کا مرتکب نہیں ہُوا جس سے جامۂ شاہی داغ آلود ہُوا ہو۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ مستغیث کی اہلیہ اپنے مکان کے صحن میں آزادانہ طور پر نہا رہی تھی۔ میں نے محض اس لئے گلوری پھینک دی۔ کہ اسے غیر کے دیکھنے کا علم ہو جائے۔ اور آئندہ وہ نہانے میں ایسی بے پرواہی سے کام نہ لے۔ ورنہ خدا شاہد ہے کہ بندہ کی نیت ہرگز ہرگز بُری نہ تھی"

"عادل! تیرا بیان اگرچہ کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو۔ لیکن اس سے دوسروں کی تسلی نہیں ہو سکتی۔ تم خائن ہو۔ ظالم ہو اور سزا کے مستحق ہو!!"

وزیر اعظم موقعہ کی نزاکت کو محسوس کر کے آگے بڑھے لیکن قبل اس کے کہ اس کی زبان سے ایک حرف نکلتا۔ بادشاہ نے پر ہیبت انداز میں کلام الٰہی کی یہ آیت تلاوت کی۔

"جب کہو۔ انصاف کی بات کہو چاہے کسی قرابندار ہی کو نقصان کیوں نہ پہنچے" (قرآن مجید)

اس پر وزیر کو کچھ کہنے سننے کی جرأت نہ ہو سکی۔ غصّے کا یہ عالم دیکھ کر شہزادہ بھی مبہوت ہو گیا۔ وہ بادشاہ کی شعلہ بار آنکھوں کو خوف و ہراس سے دیکھنے لگا۔ بادشاہ کا غصہ لمحہ بہ لمحہ

بڑھ رہا تھا۔

"جواب دو! تمہیں اس بیہودہ پن کی کیا سزا دی جائے؟"

عادل خاں نے اس طرح آہستگی سے جواب دیا جس طرح تپ دق کا ایک مریض آخری سانس لیتا ہو۔ اور وصیت کے چند آخری الفاظ کہہ رہا ہو۔

"عالم پناہ! یہ غلام اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے۔ معافی دی جائے۔ آئندہ ایسی غلطی نہ ہو گی"

عادل خاں کی اس عاجزانہ استدعا نے شیر شاہ کے دل پر اثر کرنے کی بجائے اُس کے رخشِ غضب پر مہمیز کا کام کیا۔ وہ فرطِ غیظ سے کانپنے لگا۔

تجھے معافی دے دوں۔ آج تو تجھے اتنی جرأت ہوئی ہے۔ کہ دوسروں کی بہو بیٹیوں پر گلوری پھینکی ہے۔ اور کل کو تو اتنا دلیر ہو جائے کہ اٹھوا کے اپنے ہودج میں بٹھا لے۔ اور پھر تیری دیکھا دیکھی حکومت کے دوسرے امراء اور وزراء بھی ایسی کمینہ حرکتیں کرنے لگ جائیں۔ اور میرا منہ آخرت میں سیاہ ہو۔

تھوڑی دیر کے سکوت کے بعد بادشاہ پھر گویا ہوا۔ کیا

خداوند عالم نے ہاتھی کی سواری تجھے اس لیئے بخشی ہے۔ کہ تو غریبوں کے کچے مکانوں کے پاس سے گذر کر ان کی بے پردگی کرے۔ اور اُن کی آبرو پر حملہ کرے —— !!

کیا تم یہ سمجھتے ہو۔ کہ تمہاری عزت قیمتی ہے۔ اور غریب رعایا کی عزت کی کوئی قیمت نہیں !!!

اب بادشاہ کا دامن صبر وضبط چاک چاک ہو گیا۔ اس نے اتنے زور سے چلا کر کہا کہ آواز پھٹ گئی۔ اور منہ سے کف نکلنے لگا۔

بے عزتی کا بدلہ بے عزتی سے لیا جائے گا۔ شیر شاہی انصاف یہ چاہتا ہے۔ کہ اب تم اپنی بیوی کو ہرتی کے مکان پر بھیج کر کہہ دو۔ کہ وہ بھی اسی صحن میں جا کر نہائے میں ہرتی کو تیرے ہاتھی پر سوار کرا کے بھیجتا ہوں۔ جب یہ تیری بیوی پر پان کی گلوری پھینک دے گا۔ اس وقت شیر شاہ کا انصاف پورا ہو جائے گا"!

اس فیصلہ نے شہزادے کی حمیت کو بے قرار کر دیا۔ خون گرم ہو کر رگوں میں سرعت سے دوڑنے لگا۔ آنکھیں پُرآب ہو گئیں۔ اور جسم میں کپکپی سی پیدا ہو گئی۔ تخت کے سامنے

دو زانو ہو کر ترحم طلب انداز میں بولا۔

"عالم پناہ کو اگر عادل کی بے عزتی کا تماشا دیکھنا مقصود ہے۔ تو یہ غلام حاضر ہے۔ اس کی بے دقری سے بادشاہ کی تمنا اور آرزو پوری ہو سکتی ہے۔ بھرے دربار میں بندہ کے کوڑے لگوا کر اپنی آتشِ غضب کو فرو کر لیجئے۔ مگر اے تاجدار ہند! میری بیوی رعایا کے محبوب بادشاہ کی بھی کچھ لگتی ہے اور وہ عفیفہ اس معاملہ میں مطلقاً بے قصور ہے۔ اُسے بے عزت نہ کیا جائے۔"

اپنی عزت کا درد آ رہا ہے! میں بادشاہ ہوں میرے حکم کو کوئی روکنے والا نہیں۔ تم کہتے ہو کہ عادل کی اہلیہ شیر شاہ کی بھی کچھ لگتی ہے۔ سُنو! شیر شاہ کی نظر میں غریب بنیا ہو یا ولیعہد سلطنت عادل۔ دونو کی عورتیں برابر ہیں۔ اگر بنیئے کی بے عزتی کرتے ہوئے عادل کو شرم نہیں آئی۔ تو شیر شاہ بھی اپنی بہو کی بے حرمتی برداشت کر سکتا ہے۔ جاؤ۔ میرے حکم کی تعمیل کرو۔"

ہرّی نے جب بادشاہ کا یہ فیصلہ سُنا۔ تو فرطِ مسرت سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دلگیر آواز میں بولا

"عالم پناہ بس! میں نے انصاف پا لیا۔ خدا حضور کو سلامت رکھے۔ جیسا سُنا تھا۔ ویسا ہی پایا۔ اب شہزادی صاحبہ کو وہاں جانے کی ضرورت نہیں"

بادشاہ نے دلسوزی سے ہرنی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نظر کی۔ اور فرمایا میرے مظلوم بچے! ایسا نہ کرو جس ہمت اور دلیری سے دادخواہ ہوئے ہو۔ اسی استقلال سے انتقام بھی لو۔ تاکہ آئندہ کسی شہزادے یا امیر کبیر کو ایسی جسارت نہ ہو۔

ہرنی نے تخت کر چومتے ہوئے عرض کی

"ظل اللہ! جہاں تک شہزادے کے قصور کا تعلق تھا۔ انہیں کافی سزا مل گئی ہے۔ مگر خدا مجھے اس دن تک زندہ ہی نہ رکھے کہ ناموس شاہی کی اس طرح بے حرمتی ہوتی دیکھ سکوں۔

بادشاہ نے شہزادے سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ سنتے ہو۔ عادل! لوگ بادشاہوں کو اپنا ماں باپ سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہمیں بھی ان سے وہی سلوک کرنا چاہیئے۔ جو ماں باپ اپنی اولاد سے کرتے ہیں۔ جاؤ! فریادی سے معافی مانگو جس نے فیاضی سے کام لے کر تجھے بے آبرو ہونے سے بچا لیا۔ ورنہ تو قیامت تک کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔

عادل خاں نے انتہائی ندامت سے ہرکی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"دوست! میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے تم سے معافی مانگتا ہوں۔ اور اقرار کرتا ہوں۔ کہ تمہاری بیوی میری بہن ہے۔ اور میں عمر بھر اس سے وہی سلوک کروں گا۔ جو بھائی بہنوں سے کیا کرتے ہیں۔"

یہ دیکھ کر بادشاہ کا غصہ فرد ہو گیا۔ اور اس کے چہرے پر تبسم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ خزانچی سے فرمایا۔ کہ ہرکی کو خزانے میں لے جاؤ۔ اور زر و جواہرات سے مالا مال کر دو۔ چنانچہ ہرکی کو خزانہ شاہی سے اس قدر انعام و اکرام ملا۔ کہ پشتوں تک اس کی اولاد فائدہ اٹھاتی رہی۔ اور عادل خاں بھی جب تک زندہ رہا۔ ہر تہوار پر ہرکی کے گھر وہ تحفے تحائف بھیجتا رہا۔ جو عام طور پر بھائی اپنی بہنوں کو بھیجا کرتے ہیں۔

ترقی میں کرتے تھے جو جانفشانی
حیات اُن کو ملتی تھی واں جاودانی

جہانگیر اعظم نے حقارت سے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا ”اتنے کرتوتوں کے بعد بھی معافی کا اُمیدوار ہے؟ مجھے دنیا میں بدنام کیا۔ میرے ملک میں آنے والے پردیسیوں کو اس طرح لوٹا جس طرح گدھ اور کُتّے مردہ لاش کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نوچتے ہیں۔ اگر تجھے کھُلے بندوں چھوڑ دوں۔ تو تیرے بھائی جو بنگال اور دکن جیسے دُور دراز مقامات میں بیٹھے ہیں۔ وہ کیا کچھ نہ کر سکیں گے“

(۱)

آج عبداللہ بھٹیارے کی سرائے میں معمول سے زیادہ بھیڑ تھی۔ کیونکہ کابل سے ولایتی سوداگروں کا جو قافلہ آیا تھا۔ وہ اسی کے پاس آکر ٹھہرا تھا۔ تمام کمرے لگ چکے تھے۔ لیکن ابھی بے شمار پٹھان اپنے بقچے سنبھالے صحن میں گٹھڑیاں بنے پڑے تھے۔ عبداللہ نے مغرب کے وقت کالو رام کھتری سے چار سو چارپائیاں منگوائیں۔ اور سب کی سب مسافروں میں بانٹ دیں۔ ابھی ان کو کھانا کھلانا باقی تھا۔ کہ ایک اور خچر سوار اندر داخل ہوا۔

نووارد نے ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔ اس نے آتے ہی گرجدار آواز میں کہا

"سرائے والا کہاں ہے؟"

عبداللہ لپک کر پہنچا اور کہا "خوش آمدی! اے سردار

فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں ؟"

"ایک کمرہ۔ دو چار پائیاں۔ اس جانور کا گھاس سمجھے !

نو وارد نے عورت کو ایک جانب سامان کے پاس بٹھا دیا۔ اور خود پٹھانوں کے پاس جا بیٹھا۔

پٹھان کشمش اور نیزے سے دل بہلا رہے ۔ اور کئی کھانا پکانے کے لئے آٹا گوندھ رہے تھے۔ بھٹیارے کی بیوی سامنے سے گذری۔ سب کی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئیں۔

"کتنی خوبصورت ہے ؟" ایک پٹھان بولا

"اور کتنی طرحدار ہے۔ دوسرے نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

تیسرے نے قہقہہ لگا کر کہا "کیوں نہ ہو کوتوال صاحب اس پر مرتے ہیں۔ اور شہر کے عیاش اس پر جان دیتے ہیں "

نو وارد کے کان میں کوتوال کی بھنک پڑی۔ تو چونک کر بولا "کیوں بھئی۔ شہر کا کوتوال کیسا آدمی ہے ؟"

"اس سے پوچھو!" ایک پٹھان نے بھٹیارن کی طرف

معنی خیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔
"اس بھٹیارن سے ـــــ!" اجنبی نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں! ہاں!! اسی سے جو رات بھر اس کے سینہ پر کھیلتی اور پردیسیوں سے رشوت لے لے کر اس کی جیب گرم کرتی ہے۔"
بھٹیارہ بیوی کے ہمراہ اِدھر کو آرہا تھا۔ پٹھان سرگوشی کرتے ہوئے چپ ہوگئے۔
بھٹیارن نے آکر اجنبی کو غور سے دیکھا۔ اور غلط انداز سے اس کی بیوی اور سامان پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
"آپ کہاں سے آئے؟"
کے دن قیام رہے گا؟"
آگرے میں کیا کام ہے؟
آپ کی یہاں کسی سے واقفیت بھی ہے؟
"یہ آپ کی کیا لگتی ہے؟" وغیرہ
ایک سانس میں کئی سوال کرڈالے۔
"ہم مسافر ہے اور سوداگر ہے۔ یہاں رہے گا اور بیوپار

کرے گا۔ تنگ مت کرو۔ چلو کمرہ کھولو"

"میرے پیچھے آؤ" یہ کہہ کر بھٹیارن چابیاں ہاتھ میں لے کولھے مٹکاتی ہوئی ہوٹل کی طرف روانہ ہوئی۔ پاس کے کمرے کو کھول کر اجنبی کے حوالے کیا۔ بھٹیارے نے دو چارپائیاں ڈال دیں۔ اور خچر کو باندھنے کے لئے اصطبل میں لے گیا۔

نووارد نے سامان اندر رکھ دیا۔ پھر بقچے سے ایک انگوٹھی نکال کر بھٹیارے کے پاس آیا۔ کہا ہم دُور سے آرہے ہیں۔ خرچ ختم ہوگیا ہے اسے بازار میں فروخت کر کے قیمت لا دو۔

بھٹیارن نے للچائی ہوئی نظروں سے انگوٹھی کو دیکھا۔ پھر اُسے ہاتھ میں لے کر دیکھتی ٹٹولتی مکان کو چلی گئی۔

(۲)

ایک تہائی رات گذری تھی۔ کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا

مسافر نے بڑبڑا کر کہا کون ہے؟ کیا بات ہے؟

"تمہیں کوتوال صاحب نے یاد کیا ہے"

مسافر ایک لمبا سانس لے کر بولا ـــــ اوہ ـــــ سمجھا اور پھر جلدی جلدی صافہ باندھ کر باہر نکل آیا۔ سرائے کے غرب میں کرسی پر کوتوال صاحب بیٹھے ایک پٹھان سے گرم

ہو رہے تھے ۔ دس سپاہی ایک طرف قطار بنائے کھڑے تھے ۔کوتوال نے چراغ اٹھا کر اس کی روشنی میں مسافر کو غور سے دیکھا

تمہارا نام کیا ہے ؟ اور کہاں سے آ رہے ہو ؟

مسافر نے کہا میرا نام مسعود ہے ۔ میں غزنی سے آ رہا ہوں ۔ سوداگر آدمی ہوں ۔ یہاں بیوپار کروں گا ۔

"یہ انگوٹھی تمہیں کہاں سے ملی ؟"

" یہ انگوٹھی مجھے ورثہ میں ملی ہے اس کے علاوہ میری بیوی کے پاس اور بھی بہت سے زیورات ہیں" یہ کہہ کر مسعود اندر گیا ۔ اور بیوی کے زیورات کا بکس اٹھا لایا ۔

کوتوال نے چند زیورات کو الٹ پلٹ کر دیکھا ۔ ہیروں کی چمک دمک سے اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں ۔کہا یہ زیورات چوری کے معلوم ہوتے ہیں ۔ جب تک ان کے متعلق پوری تحقیقات نہ ہو جائے ۔ تم کو حوالات میں رہنا پڑے گا ۔مسعود پر اس دھمکی کا کچھ اثر نہ ہوا ۔ اس نے بے پرواہی سے کہا ۔ آنرا کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک ۔ جتنی دفعہ جی چاہے تحقیقات کر لیجئے ۔ مگر ہم حوالات میں کیوں جائیں اور کیا یہ سرائے حوالات سے کم ہے ۔ اس بھٹیارن سے ہم کو سنبھال لینا ۔

بھٹیارن کے لفظ پر کوتوال مسکرایا۔ اور بھٹیارن پر معنی خیز نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ کیوں ــــ؟ اس کا ذمہ لیتی ہو؟

ہاں مجھے تو یہ شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اور خاص کر زیورات بھی تو آپ کے پاس ہیں۔ رات کو سرائے کا پھاٹک بھی بند رہتا ہے یہ بھاگ کر کہاں جائے گا!"

"بہتر" کوتوال نے تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔ یہ دیکھ کر کہ کوتوال کا پارہ ٹھنڈا ہو گیا مسعود نے جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر آگے پیش کیا اور کہا " اس کاغذ پر زیورات کی رسید لکھ دیجئے "

"تم بہت ہی بے ادب ہو" کوتوال نے برہم ہو کر جواب دیا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ میں اس شہر کا کوتوال ہوں بادشاہ اور وزیر کے بعد اس شہر پر میرا سکّہ چلتا ہے۔ اتنے بڑے حاکم پر خیانت کا گمان کرتے ہوئے تجھے شرم بھی نہیں آئی؟"

مسعود بولا جناب والا کا عہدہ بندہ کو معلوم ہے مگر قرآن شریف میں خداوند پاک نے حکم دیا ہے۔ کہ اپنے معاملات لکھ لیا کرو۔ ان الفاظ نے کوتوال کی آتش غضب پر مہمیز کا

کام کیا ۔ گرج کر بولا " گستاخ آدمی ! تو مجھے شریعت کے سبق دیتا ہے ۔ ہم خود قرآن وحدیث کے حافظ ہیں ۔ اور دین کے معاملات کو تجھ سے زیادہ سمجھ سکتے ہیں ۔ کوتوال کھڑا ہوگیا۔ زیورات کا ڈبہ بھٹیارن کے سپرد کیا ۔ اور انگوٹھی خود رکھ لی ۔ ایک بار گرم نگاہوں سے مسعود پر نظر ڈالی اور اپنے سپاہیوں کے ہمراہ چل دیا۔

(۳)

دوسرے دن دوپہر تک مسعود کوتوال کی انتظار کرتا رہا ۔ مگر وہ نہ آیا۔ تنگ ہو کر بھٹیارن کے پاس آیا ۔ اور پوچھا " کوتوال کب آئے گا ؟ "

بھٹیارن مسافروں میں کھانا تقسیم کر رہی تھی ۔ مسکرا کر بولی ۔ بڑے میاں ! صبر سے کام لو ۔ تم جانتے ہو کوتوال صاحب سارے شہر کے مالک ہیں ۔ اتنا کام ہوتا ہے ۔ کہ انہیں سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ہوتی ۔ جب موقع ملے گا ۔ آ جائیں گے ۔

مسعود اپنے کمرے کے سامنے جا بیٹھا ۔ بھٹیارن نے نہایت پر تکلف کھانا بھجوایا ۔ اس نے کچھ اندر بھیجا ۔ اور

کچھ خود کھایا۔ سرائے کے جن پٹھانوں کو اس واقعہ کا علم ہو چکا تھا۔ وہ مسعود سے ہمدردی کرتے رہے انہوں نے یہ بھی بتایا۔ کہ ان کے مال میں کوتوال کا حصّہ مقرر ہے۔ جونہی وہ یہاں آکر سامان اُتارتے ہیں۔ بھٹیارن اس کا حِصّہ وصول کر لیتی ہے۔

تین دن گذر گئے۔ مگر کوتوال پھر سرائے میں نہ آیا۔ مسعود نے بھٹیارے سے کہا۔ کہ اگر کوتوال کو فرصت نہیں۔ تو تم مجھے وہاں چھوڑ آؤ۔ مگر اس نے بگڑ کر ہاتھ جھٹک دیا۔ آخر مسعود خود کوتوالی میں پہنچا۔ لیکن وہاں کوتوال نے بات تک نہ سُنی۔ اور سپاہیوں نے دھکّے دے کر کوتوالی سے نکال دیا۔

مسعود نہایت مایوس ہو کر لوٹا۔ سرائے کے پٹھانوں نے کہا۔ کہ اگر تم نے زیورات حاصل کرنے ہیں۔ تو جمنا پر جا کر زنجیر عدل کھینچو۔ بادشاہ تمہارا انصاف کرے گا۔ اور کوتوال کو قرار واقعی سزا ملے گی۔ مسعود نے زنجیر عدل کا پورا پتہ دریافت کر کے بیوی سمیت جمنا کا رُخ کیا۔ قلعے کے پاس مثمن بُرج کے ساتھ کئی من کی سنہری زنجیر لٹک رہی تھی۔ جس کا دوسرا

سر ایک مینار کے ساتھ بندھا تھا۔ اور زنجیر کے ساتھ گھنٹے لگے ہوئے تھے۔

مسعود نے زنجیر کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ ایک عجیب غلغلہ برپا ہُوا جس کی آواز دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ معلوم ہوتا۔ کہ محل کے گھنٹے ابھی تک بج رہے ہیں۔ دو تین دفعہ زنجیر ہلانے کے بعد مسعود محل کی طرف منہ کر کے دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

"جھروکے" سے پُر جلال آواز گونجی "کس نے پکارا ہم کو؟"

حضور والا! ہم اجنبی مسافر ہیں۔ عبداللہ بھٹیارے کی سرائے میں ٹھہرے تھے۔ کوتوال نے ہم سے زیورات کا ڈبہ چھین لیا۔ ہم نے بہتیری منت سماجت کی مگر اس نے نہیں مانا۔ دوہائی ہے جہاں پناہ کی!"

بادشاہ نے گہری نظر سے فریادی کے سراپا کو دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ بادشاہ سلامت فریادی کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

شہنشاہ نے مسکرا کر کہا "فریادی تسلی رکھ۔ ہم انصاف کریں گے"

خواجہ سرا سے حکم ہُوا ۔ کہ فریادی کو دربار میں سے چلو۔ وہیں اس کا مقدمہ سماعت ہوگا ۔

(۴)

مسعود اور اس کی بیوی خواجہ سرا کے ساتھ خندق کے گرد چکر کاٹتے ہوئے دہلی دروازے سے قلعے میں داخل ہوئے ۔ چپے چپے پر پہرے دار تعینات تھے ۔ روشن چوکی پر شہنائیاں بج رہی تھیں ۔ خواجہ سرا نے کہا۔ "ہم ابھی چکر کاٹ رہے ہیں ۔ لیکن جہاں پناہ دربار میں بھی پہنچ گئے " تمہیں یہ کیسے معلوم ہُوا؟" مسعود نے تعجب سے سوال کیا " نوبت جو بج رہی ہے" خواجہ سرا نے مسکراتے ہوئے کہا ۔ دیوان عام قریب آچکا تھا۔ شہنشاہ نورالدین جہانگیر اکبری تخت پر بیٹھے داد انصاف دے رہے تھے ۔مسعود کو دور سے آتا ہُوا دیکھ کر امیر الامرا مرزا محمد شریف سے خطاب کیا ۔ اور فرمایا

بادشاہ "تم نے کبھی کوتوال شہر کے متعلق بھی تحقیقات کی ہے کہ وہ کیسا آدمی ہے ؟"

وزیر اعظم ۔ بظاہر وہ اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے ۔کبھی اس کے خلاف شکایت بھی نہیں گذری ۔ باطن کے متعلق کچھ کہا

نہیں جاسکتا۔ ع۔

محتسب را درونِ خانہ چہ کار!

بادشاہ۔ بعض افسر ایسے جابر ہوتے ہیں۔ کہ اُن کے رعب سے لوگوں کو شکایت کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔

وزیرِ اعظم۔ "بجا ارشاد ہُوا جہاں پناہ"

بادشاہ۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم خود مسافروں کا بھیس بدل کر رعایا کا حال معلوم کرو۔ ہمیں خبر ملی ہے۔ کہ ۔۔ رشوت لیتا ہے۔

جہانگیر نے مسکراتے ہوئے وزیر پر نظر ڈالی۔ اور فرمایا۔ دیکھو مرزا محمد شریف! تم اور ہم بچپن کے ساتھی ہیں۔ ہمیشہ دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے شریک رہے۔ ہم نے تمہیں نوازا اور امیر الامرائی سے سرفراز کیا۔ حکومت کے کاروبار میں اگر تم تندہی سے میرا ہاتھ نہ بٹاؤ تو میں ایسی عظیم الشان خدمت سے کیسے عہدہ برآ ہوسکتا ہوں"

وزیرِ اعظم۔ حضورِ والا پر فدوی کی جان نثاری مخفی نہیں۔ عمر اسی دُھن میں بسر ہوگئی۔ اب حیاتِ مستعار کے چند ایام باقی ہیں۔ اُمید ہے۔ کہ خدائے ذوالجلال وہ بھی

حضور کی خیر سگالی میں بسر کرنے کی توفیق عطا کرے گا۔"
مسعود تخت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ بادشاہ نے نہایت ہی نرمی سے کہا۔
"اے پردیسی مسافر! بول کیا معاملہ ہے؟"
مسعود آداب شاہی بجا لانے کے لئے زمین تک جھک گیا۔ اور انتہائی ادب سے یوں عرض گذار ہوا۔
جہاں پناہ! یہ غریب الدیار بال بچوں کے لئے کچھ کما لانے کو اس سنہری مملکت میں داخل ہوا تھا۔ افسوس ہے کہ حضور کے کوتوال نے غلام کی ساری پونجی چھین لی"
امرائے دربار حیرت سے فریادی کو دیکھنے لگے۔ ان کو اگرچہ کوتوال کی بے اعتدالیوں کا پورا علم تھا۔ مگر انہیں یہ خواب و گمان بھی نہ تھا۔ کہ اس کی رشوت خوری کا بھانڈا اس طرح چوراہے پر پھوٹے گا۔ مسعود اپنی درد بھری کہانی اس طرح بیان کر رہا تھا۔
خداوند عالم! یہ غلام جو کچھ غزنی سے لے کر چلا تھا وہ اس طولانی سفر کی نذر ہوا۔ صرف بیوی کے چند زیور بچ رہے تھے۔ وہ کوتوال شہر نے چھین لئے۔ اُلٹا ہمیں

چوری کے شبہ میں گرفتار کر کے قید کرنا چاہتا تھا۔ کہ ہم
نے منت زاری کر کے جان بچائی۔"
شہنشاہ نے معنی خیز نگاہوں سے وزیر اعظم کو دیکھا۔ یہ ہیں
آپ کے کوتوال صاحب! پھر گرج کر کہا "کوتوال حاضر ہو!"
کوتوال دربار میں موجود تھا۔ اور یہ تمام کارروائی بچشم خود
دیکھ رہا تھا۔ شش و پنج کے عالم میں آگے بڑھ کر زمین بوس
ہوا۔ شہنشاہ نے للکار کر کہا۔
"کوتوال! یہ پردیسی تم پر زیورات چھیننے کا الزام لگاتا ہے
اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟"
"خداوند یہ جھوٹ بکتا ہے۔ میں نے آج سے پہلے کبھی
اس کی صورت بھی نہیں دیکھی۔"
"بہتر" شہنشاہ نے وزیر اعظم سے فرمایا۔ عبداللہ بھٹیارہ
اور اس کی بیوی کو اسی وقت حاضر دربار کیا جائے۔ پیادے
فوراً دوڑ کر گئے۔ اور بھٹیارے کو اس کی بیوی سمیت کشاں
کشاں لے آئے۔
شہنشاہ نے کوتوال کو تخت کے پیچھے کھڑا کر دیا۔ تاکہ
بھٹیارہ اور اس کی بھٹیاری اسے نہ دیکھ سکیں۔ شہنشاہ

نے نہایت ملائمت سے بھٹیارے کو خطاب کیا۔

"جس وقت مسافر نے اپنے زیورات کوتوال کو دئے تھے کیا تیری بیوی وہاں موجود تھی؟"

"جی ہاں خداوند! میری بیوی اس وقت موجود تھی" بھٹیارے نے عاجزی سے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے عرض کی۔ اب بادشاہ نے بھٹیاری کی طرف توجہ فرمائی۔

"کیا تو نے زیورات شمار کئے تھے؟"

"جی ہاں جہاں پناہ، کوتوال صاحب صرف ایک انگوٹھی ہمراہ لے گئے تھے۔ باقی زیورات میرے پاس امانت کے طور پر چھوڑ گئے تھے"

بادشاہ نے کوتوال کو سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپتا ہوا پیش ہوا۔ بادشاہ نے پوچھا۔ کیا ابھی تک تو نے مسافر کو نہیں پہچانا؟"

کوتوال نے ڈرتے ڈرتے مسافر پر نظر کی۔ پردیسی نے سر سے ڈھاٹا ہٹایا۔ اور مصنوعی داڑھی اُتار لی۔ کوتوال کے منہ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی "شیخ سالم"

دربار بھی حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا۔ جہاں پناہ نے

غضبناک ہوکر فرمایا" شیطان! کیا تو یہ سمجھتا ہے۔ کہ بادشاہ تیری کرتوتوں سے غافل ہے؟ ہمارے کانوں میں تیری ساری باتیں پہنچ رہی تھیں۔ ہم اس انتظار میں تھے۔ کہ کوئی آکر تیرا راز فاش کرے۔ مگر افسوس کہ کسی کو بھی تیرے خلاف دادخواہ ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر ہم نے تیرا بھانڈا پھوڑ ڈالا بدبخت! تو نے ہماری انگشتری کو بھی نہ پہنچانا ـــــ لا پیش کر!

کوتوال نے جیب سے انگشتری نکال کر سر اور آنکھوں سے لگاتے ہوئے خدمتِ اقدس میں پیش کی۔ اور گڑ گڑا کر معافی کا خواستگار ہوا۔

بادشاہ نے حقارت سے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا:۔

اتنی کرتوتوں کے بعد بھی معافی کا خواستگار ہے؟ مجھے دنیا میں بدنام کیا۔ میرے ملک میں آنے والے پردیسیوں کو اس طرح لوٹا۔ جس طرح گدھ اور کتے مردہ لاش کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر نوچتے ہیں۔ اگر تجھے کھلے بندوں چھوڑ دوں تو تیرے بھائی جو بنگال اور دکن جیسے دُور رس مقامات میں بیٹھے ہیں۔ وہ کیا کچھ نہ کریں گے ـــــ! کوتوال!! تم آج نوکری سے برطرف کئے جاتے ہو۔ (وزیراعظم کی

طرف خطاب کرتے ہوئے) وزیر صاحب! اس بدذات کو گدھے پر سوار کرا کے شہر میں پھراؤ۔ اور جن مظلوموں کا یہ مال لوٹ چکا ہے۔ ایک مکمل فرد تیار کر کے اس کی جیب سے ان سب کی حق رسی کرو۔ جب لوگوں کا پیسہ پیسہ ادا ہو جائے۔ تو اسے بنگال کی طرف نکال دو۔"

پھر بادشاہ نے بھٹیارے اور بھٹیارن پر قہر آلود نگاہ ڈالی۔ فرمایا "انہیں ابھی اسی وقت شہر سے نکال دو۔ اور ان کا کل سرمایہ سرائے والوں میں بانٹ دو۔"

شیخ سالم ابھی تک دست بستہ کھڑا تھا۔ جہانگیر نے گلے سے قیمتی مالا اُتار کر اس پر پھینکی۔ اور عورت سے جو کہ شاہی محل کی خادمہ تھی۔ فرمایا "جا ملکہ تجھے راضی کرے گی۔"

اتنے میں تخت کے پس پردہ کو حرکت ہوئی۔ اور ایک مرصّع ہار خادمہ کے گلے میں آ پڑا۔

شہنشاہ نے مسکرا کر سالم سے فرمایا۔ کہ کوتوال نے کچھ

نہیں کیا۔ اگر تجھے حوالات میں ڈال کر اپنے سپاہیوں سے پٹواتا۔ تو بڑا مزہ آتا۔ اس فقرے سے خوب لطیفہ ہُوا۔ اور سہما ہُوا دربار ایک دفعہ پھر گرم ہو گیا۔

وہ پھرتے تھے راتوں کو چھپ چھپ کے در در
کہ شرمائیں اپنا کہیں عیب سن کر

توزک جہانگیری
کا
ایک ورق

"میں تجھے کشتنی اور گردن زدنی سمجھتا ہوں
اس لئے نہیں کہ تو نے مجھے شرابی کہا اور
نہ اس لئے کہ تو نے میرے سر کی قسم
کی پرواہ نہ کی۔ بلکہ اس لئے کہ تو ایک
شریف عورت کی آبرو لینے آیا ـــــ!"

جہانگیر اعظم

(۱)

بچپن سے یہ بات میرے ملاحظہ سے گذر رہی تھی۔ کہ مظلوم آدمیوں کو بادشاہ تک پہنچنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اور جو "عرض بیگی" باہر کی رپورٹیں حضور میں عرض کرنے پر مقرر ہیں وہ بڑی رشوتیں لینے کے باوجود بھی صحیح واقعہ بادشاہ کی خدمت میں نہیں پہنچنے دیتے۔ اس سے بادشاہ کو دادرسی میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میرے والد ماجد (اکبر اعظم) نے درشن کا طریقہ اسی غرض سے جاری کیا تھا۔ کہ اگر کسی کو براہ راست اپنے بادشاہ سے کچھ عرض کرنا ہو۔ تو کہہ دے مگر اس موقعہ پر امرا کا اتنا ہجوم ہو جاتا۔ کہ فریادی ان کی موجودگی میں کچھ عرض نہ کر سکتے تھے۔

(۲)

میں نے ان تمام امور پر اچھی طرح غور و فکر کرنے کے بعد حکم دیا کہ بیس من خالص سونے کی ایک زنجیر بنائی جائے۔ اس

کا ایک سرا میرے محل کے مثمن برج سے آویزاں کیا جائے۔ اور دوسرا سرا ایک پکے مینار سے جو برلب دریا واقع ہے۔ باندھا جائے۔ زنجیر سے گھنٹے باندھ دئیے جائیں۔ تاکہ جب فریادی اُسے ہلائے۔ تو ان گھنٹوں سے ایسی بے ہنگام آواز پیدا ہو۔ کہ میں محل کے جس کونے میں بھی ہوا کروں۔ اس آواز کو سن کر فریادی کے پاس آسکوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے خبر رسانی کا ایک وسیع محکمہ بنایا۔ ہر امیر کے ساتھ کوئی نہ کوئی مخبر لگا رہتا جو اس کی کارگذاریوں سے مابدولت کو روزانہ اطلاع دیا کرتا۔ میں نے محل کا ایک گوشہ محض ان خبروں کے سننے کے لئے خاص کر رکھا تھا۔ رات کو یہاں ہر وقت پرچہ نولیس آکر مجھ سے ملاقات کر سکتے تھے۔ بالعموم میں ہمیشہ اسی جگہ سویا کرتا تھا۔ اگر حرم سرا میں سوتا۔ تو یہاں ایک راز دار خواجہ سرا موجود رہتا۔ جو ضرورت کے وقت مجھے حرم سرا میں آکر اطلاع دیتا۔

(۳)

ایک رات مجھے ایک مخبر نے آکر جگایا۔ اور گھبرا کر کہا۔ جلدی کیجئے حضور۔ ورنہ ایک پاک دامن عورت کی عصمت

برباد ہو جائے گی۔ میں فوراً کھڑا ہو گیا۔ دل میں خیال گذرا۔ ہو سکتا ہے کہ پرچہ نویس میرے کسی دشمن کے ساتھ ملا ہوا ہو۔ اور بُری نیت سے میرے پاس آیا ہو۔ مگر اُسی وقت میں نے اپنے پروردگار کی طرف سے اپنے اندر ایک روشنی دیکھی۔ جس سے مجھے اطمینان ہو گیا۔ کہ یہ شخص دھوکا باز نہیں ہے۔ چنانچہ تلوار اٹھا حافظ حقیقی کے بھروسے پر اس کے ساتھ چل پڑا۔

(۴)

راستے میں پرچہ نویس نے بتایا۔ کہ رات کو جب ملزم بے وقت گھر سے نکلا۔ تو میں نظر بچا کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ ایک غریب عورت کے مکان میں گھس گیا۔ اور میں دیوار سے چمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے سُنا۔ کوئی عورت گھبرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی ہے "تجھے بادشاہ کے سر کی قسم! میری آبرو خراب نہ کر" پھر مجھے دھکم دھکا کی آواز سُنائی دی۔ جس سے میں نے اندازہ کیا۔ کہ وہ عفیفہ اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اس پر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں جہاں پناہ کی خدمت میں دوڑا آیا۔

پرچہ نویس کے اس بیان سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور غم وغصہ سے میرا خون کھولنے لگا۔ ہم ایسے وقت اس مظلومہ کے گھر پہنچے۔ جبکہ وہ بدکار امیر اس خاتون کے ساتھ لپٹا ہوا کہہ رہا تھا۔ کہ اگر تو میرا کہا مان لے تو میں تجھے اپنی بیگم بنا لوں گا۔ اور تیری ساری عمر عیش و مسرت میں گذرے گی۔ لیکن وہ پاک دامنہ برابر انکار کرتی رہی۔ کہ میں شریف ہوں۔ اور شریف عورتیں اپنے غریب خاوندوں کو امیروں سے بھی اچھا سمجھتی ہیں"

میں کچھ دیر تک اوٹ میں کھڑا ہو کر دونو کی باتیں سنتا رہا۔ اور دونو کو دیکھتا بھی رہا۔ مجھے زیادہ خوشی اس بات سے ہوئی۔ کہ میں اپنی ایک مظلوم رعایا کی امداد کے لئے بروقت پہنچ گیا تھا۔

امیر نے گرج کر کہا۔ کہ اگر تو نے انکار کیا۔ تو میں تجھے اور تیرے خاوند کو قتل کر دوں گا۔ عورت نے دلیری سے جواب دیا۔ کہ میرا بادشاہ میرے خدا کا نائب ہے۔ وہ تجھے اس گناہ کی سزا دینے کے لئے آ پہنچے گا۔

امیر بولا۔ اری کم بخت! وہ شرابی تو محل میں پڑا سوتا

ہوگا۔ اُسے تیرے حال کا کیا علم!"

(۵)

امیر اب حد سے بڑھا جا رہا تھا۔ میں نے زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ تلوار میان سے نکال کر آگے بڑھا۔ امیر نے خیال کیا۔ شاید عورت کا شوہر آگیا ہے۔ وہ تلوار کھینچ کر کھڑا ہوگیا۔ اور چاہتا تھا کہ مجھ پر وار کرے۔ کہ برابر سے میرے خفیہ نویس نے پکار کر کہا "با ادب۔ با ملاحظہ۔ ہوشیار۔ جہاں پناہ سلامت!" یہ سنتے ہی امیر کانپ اُٹھا۔ اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ میرے قدموں میں جُھک کر کہنے لگا۔ حضور سے انصاف کی بھیک مانگتا ہوں۔ یہ عورت میری کنیز ہے۔ اور بھاگ کر یہاں آچھپی ہے۔

میں نے عورت سے متوجہ ہو کر پوچھا "کیا یہ درست ہے؟"

وہ بچاری مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

جہاں پناہ! یہ شخص غلط کہتا ہے۔ میں حضور کے چوبدار دلاور خاں کی بیٹی اور جناب کے جان نثار سپاہی قائم بیگ

کی بیوی ہوں۔

میں نے پھر امیر سے سوال کیا "کیا یہ عورت سچ کہہ رہی ہے؟"

"اگر یہ عورت تیری کنیز ہے تو اس کا نام بتاؤ؟"

"تو نے اسے کب خریدا؟"

"کتنے کو خریدا؟"

"کہاں سے خریدا؟"

امیر میرے کسی سوال کا جواب نہ دے سکا۔ رو کر عرض کی "حضور خطاوار ہوں۔ مجھ پر رحم فرمایا جائے"

میں نے کہا "مجھ سے رحم چاہتے ہو؟ ایک شرابی سے؟ اس عورت نے تجھے میرے سر کی قسم دی۔ اس وقت تجھے کچھ خیال نہ آیا؟ بلکہ تو نے نہایت بے حیائی سے میری موجودگی میں جواب دیا۔ کہ بادشاہ شرابی ہے اور وہ محل میں پڑا سوتا ہوگا"

اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ ہم شراب پیتے ہیں۔ لیکن غفلت اور بدمستی کا الزام محض تہمت ہے۔ میں تجھے کشتنی اور گردن زدنی سمجھتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ تو نے مجھے

شرابی کہا۔ اور نہ اس لئے کہ تو نے میرے سر کی قسم کی پروا نہ کی۔ بلکہ اس لئے کہ تو ایک شریف عورت کی آبرو لینے آیا۔ اور غریب عورت کو ستایا۔"

(۶)

یہ کہہ کر میں نے تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا۔ کہ امیر کا سر کٹ کر دور جا پڑا۔ پرچہ نویس کو حسن کارکردگی کے صلہ میں سنو اشرفیاں عطا کیں۔ عورت سے فرمایا۔ کہ تو میری رعایا کے لئے نیک نمونہ ہے۔ ہم تیری پاک دامنی سے بہت خوش ہوئے اور تیرے خوش قسمت خاوند کو مقتول امیر کی منقولہ و غیر منقولہ ساری جائیداد بخشی۔ اب تم واقعی ایک امیر کبیر کی بیگم ہو" یہ کہہ کر میں اپنے محل کو لوٹ آیا۔

(آزاد ترجمہ)

رہِ حق میں تھی دوڑ اور بھاگ اُن کی
فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ اُن کی
بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ اُن کی
شریعت کے قبضے میں تھی باگ اُن کی

جہاں کر دیا نرم نرما گئے وہ
جہاں کر دیا گرم گرما گئے وہ

کوٹ نورنگ
کی
تباہی

"اے نیک بخت! نورنگ خاں نے تجھ سے ایک جھونپڑا چھینا تھا۔میں نے اس سے یہ سارا شہر چھین لیا۔اس نے تیرا ایک مکان گرایا تھا۔مگر دیکھ! میں اس کے فلک بوس محلات سے کیا سلوک کرتا ہوں!!"

نواب محمد شجاع

ضلع ملتان میں کوٹلی نجابت کے قریب کوٹ نورنگ کے کھنڈرات ملتے ہیں۔ محمد شجاع خاں کے دَور حکومت میں یہاں ایک خوبصورت شہر آباد تھا۔ جو ۱۷۷ء میں اچانک منہدم کرا دیا گیا۔ یہ داستان اسی کے گرد گھومتی ہے

سازش

سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اس کی زرد زرد کرنیں کوٹ نورنگ کے محلاّت کو سنہری خلعتیں پہنا رہی تھیں " ابّن " شہر کا مشہور بدمعاش اپنے مکان کے باہر نصیر کے ساتھ بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اچانک اس کی نگاہ جلال پور کی سڑک پر دَوڑ گئی ۔ آنکھوں کے گرد اپنے ہاتھوں سے ہالہ بناتے ہوئے نصیر سے بولا۔ دیکھنا کہیں یہ رامول اور اس کی ماں تو نہیں جا رہے ۔

معلوم تو وہی ہوتے ہیں ۔ نصیر نے سرگوشی کرتے ہوئے

جواب دیا۔

ابن نے حقہ نصیر کو پکڑوا دیا۔ اور بڑبڑاتے ہوئے اُٹھا۔ تخت پوش کے نیچے سے جوتا نکالا۔ ایک دو دفعہ زمین پر مار کر اس کی خاک دھول صاف کی۔ اور پہن کر رامون کے تعاقب میں چل پڑا۔

"کہاں جاتے ہو بھیا" نصیر نے کش لگاتے ہوئے کہا۔

"ذرا راوانی تک جا رہا ہوں ابھی آیا۔ ہاں ذرا" تتصو" کو بھینس نکال دینا۔ بچاری رات سے بھوکی ہے"

ابن لمبے لمبے ڈگ بھرتا رامون کے قریب جا پہنچا۔ بڑھیا کمر پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ کچھ بہرہ پن اور کچھ جوتے کی چیخ چیخ وہ کسی خیال میں کھوئی ہوئی ایک ہی رفتار سے چل رہی تھی۔ البتہ رامون اِدھر اُدھر دیکھتا اور راستے کے کنکروں کو پاؤں سے کک (Kick) لگاتا اچھلتا کودتا جا رہا تھا۔ ابن کو آتا دیکھا تو ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

"کدھر جا رہے ہو ابن چچا؟" رامون نے مسکرا کر کہا

"بس یہیں "کوٹ سدھا" تک۔ تم کہاں چلے ہو؟"

ابن کی نگاہیں بڑھیا کا تعاقب کر رہی تھیں۔

ہم —— ہم !! راموں نے انگلی سے سینے کو چھوتے ہوئے ابن کی جانب نگاہ اٹھائی۔

"ہاں۔ ہاں تم" ابن نے کھل کھلا کر کہا۔ تو گویا میں کسی دوسرے سے مخاطب تھا ——!

راموں معصومانہ شرارت سے ہنسا۔ چچا ہم "ٹھٹھ گھلواں" جا رہے ہیں۔ اور کچھ "روم شام" میں بھی کام ہے۔

اتنے میں بڑھیا نے مڑ کر دیکھا۔ ابن نے آگے بڑھ کر کہا" ماں سویرے سویرے کہاں چلی ہو ——!"

بڑھیا رُک گئی۔ اوپر نیچے گھور کر دیکھا" کون! ابن بیٹا!!"

خوشی سے بڑھیا کی باچھیں کھل گئیں۔ لعابِ دہن کو چوستے ہوئے سر کو اوپر اٹھایا۔ گویا" ابن" کو اپنی" رام کہانی" سنانے سے پہلے وہ خود اس سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہے۔

"میں راموں کو لے کر اس کے ماموں کے پاس جا رہی ہوں بیٹا!"

"اچھا ہری ملک کے پاس!"

"ہاں بھائی! کچھ سنا تم نے! خان نے میرا مکان چھین لیا۔ بڑھیا نے وفورِ غم سے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔

"ابن" سب کچھ جانتا تھا۔ مگر اس وقت تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے حیرت واستعجاب میں ڈوبی ہوئی آواز سے بولا "ہیں! کب اور کیوں؟"

"بڑھیا نے لاٹھی پھینک دی۔ اور سڑک سے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھ سے سر کو پکڑ کر ایک دو گرم گرم قطرے آنکھوں سے گرائے۔ کہا" بیٹا تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے۔ کہ میرا مکان خان کے محل کے قریب پڑتا تھا۔ ایک دن خان نے مجھے محل میں بلایا۔ کہا" نیک بخت! ہم محل کے قریب کچہری کی عمارت بنانا چاہتے ہیں۔ اگر اپنا مکان دے دو۔ تو ہم منہ مانگا انعام دیں گے" میں نے کہا۔ نواب صاحب تم جانتے ہو میرے ناموس کی یہی پونجی ہے اور اس کے بڑوں کی نشانی ہے۔ خدا نے تم کو ملک دیا ہے بخت اور تخت عنایت کیا ہے۔ اتنے بڑے بڑے محل بخشے ہیں غریب کی جھونپڑی پر لالچ کا ہاتھ نہ بڑھا"

بڑھیا سستانے کے لئے رُک گئی" ابن" بے صبری سے بولا" پھر؟"

بڑھیا نے کھانستے ہوئے کہا۔ خاں صاحب کچھ دیر سوچتے

رہے - پھر بولے - مائی! تیرے راموں کا کوئی رشتہ دار بھی ہے؟
میں نے کہا "ہری ملک" میرا سگا بھائی ہے - اور وہ ٹھٹھہ
میں رہتا ہے - وہیں اس کی نمبرداری بھی ہے - کہا "اگر
تیرے مکان کا معاوضہ ٹھٹھہ میں دے دیں تو پھر راضی ہو
جائے گی؟" بھائی کا نام سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا - دل
میں سوچا اگر بھائی کے پاس جگہ ملتی ہے - تو پھر کیا حرج ہے -
خان صاحب پھر مخاطب ہوئے - فرمایا "کتنی زمین لوگی؟"

میں نے کہا "جو سرکار کا انصاف دلا دے"

فرمایا "ٹھٹھہ کے موضع میں دو سو بیگھے اراضی ہم اس
مکان کے معاوضہ میں مرحمت فرماتے ہیں - کیوں! راضی ہو؟"

ارے بابا "ابن"! اتنی بڑی زمین سن کر خوشی سے تو
میرے آنسو نکل آئے - کہا آپ کتنے دیالو ہیں مہاراج! جو
ایک جھونپڑی کے بدلے اتنی زمین دیتے ہیں" پھر راموں
سے پوچھا "کیوں بیٹا! راضی ہے؟"

مگر یہ معصوم بچہ کیا جانے کہ دو سو بیگھے کتنی بڑی زمین ہوتی
ہے - کہنے لگا میں تو پتاجی کا مکان ہرگز نہ دوں گا - خواہ خان صاحب
اپنا محل کیوں نہ دے دیں"

رامون نے بات کاٹتے ہوئے کہا "کیوں چچا! مکان بیچنا کوئی اچھی بات ہے؟"

"ابن" مسکرایا۔ کہا "بیٹا درست کہتے ہو۔ مکان تو دوالئے بیچتے ہیں۔ تم کوئی دوالئے ہو!!"

بڑھیا نے آنسو پونچھتے ہوئے ابن کو پھر مخاطب کیا "بس بیٹا۔ میں نے تو انکار ہی کر دیا۔ مگر میرے انکار سے کیا بنتا تھا۔ بڑے آدمیوں سے پالا نہ پڑے۔ ایک دن ہم ماں بیٹا کوٹلی نجابت چودھری گردھاری رام کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو مکان کا پتہ تک نہ تھا۔ نورنگ خاں نے روڑے کنکر تک اٹھوا لئے تھے جہاں میں نے شباب کی ہزاروں پُرلطف گھڑیاں گذاری تھیں۔ آج اس کا نشان تک نہ تھا۔ وہ مندر مکان جو میرے سورگباشی پتی کی یادگار تھا۔ جس میں میرا رامون پیدا ہوا۔ جہاں میرے پتی نے اپنی آتما پرماتما کے حوالے کی۔ آج ہمیشہ کے لئے مٹ چکا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ خان کے آدمی میری انتظار میں تھے۔ خان کو اطلاع کی۔ وہ بڑی شان سے تسبیح ہاتھ میں لئے باہر نکل آئے۔ کہا۔ مائی! تیری خواہش کے مطابق ہم نے ٹھٹھ گھلوان

میں دو سو بیگھے اراضی راموں کے نام لکھ دیئے ہیں۔ تمہارا سامان دیوان خانے کے کمرے میں موجود ہے۔ اٹھوا کر لے جا۔ اور بھائی کے پاس آرام سے زندگی بسر کر۔

میں روئی۔ اور بے اختیار روئی۔ میرا راموں بھی سسکیاں بھر کر روتا رہا۔ خان نے ہزار تسلی دی۔ مگر ہمارا غم ہلکا نہ ہُوا۔ میں نے کہا "نواب صاحب! آپ نے دولت کے گھمنڈ میں مجھ غریب کا مکان گرا دیا۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ ایک بیوہ کی آہ اور یتیم کی فریاد رنگ لائے بغیر نہ رہے گی۔ میں روتی ہوئی باہر چلی آئی۔ اب "ہرتی" کے پاس جا رہی ہوں۔ کہ وہ آ کر ہمارا سامان لے جائے۔

"ابن" نے ظاہرا بہت افسوس کیا۔ اور کہا ماں پٹھانوں کا حوصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ آج تمہارا مکان چھینا ہے۔ کل میرا انگڑ کھنگڑ باہر نکال پھینکیں گے۔

اب بڑھیا ذرا سنبھلی۔ اور سنبھل کر بولی "ہاں یہ تو بالکل درست ہے۔ اگر راموں کا مکان چھینا جا سکتا ہے۔ تو ابن اور نصیر کس باغ کی مولی ہیں۔

ابن ذرا قریب ہو بیٹھا۔ اور رازدارانہ طور پر بولا۔ ماں! اگر

میرا کہا مانے تو ٹھٹھ کی بجائے شجاع آباد چلی جا اور نواب محمد شجاع خاں کو جاکر فریاد سُنا۔ وہ بڑا منصف اور رعایا پرور بادشاہ ہے۔ اگر اگر نورنگ خاں کو کچا نہ چبا جائے۔ تو میرے منہ پر تھوکنا۔

بڑھیا کے چہرے پر تبسم کھنڈ گیا۔ "کیا تم ٹھیک کہہ رہے ہو ابّن!"

"خدا قسم۔ ایمان سے" ابن نے یقین دلاتے ہوئے کہا بوڑھیا نے لاٹھی اُٹھالی اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اُٹھی۔ کہا بس آج ہی ماموں کو لے کر سیدھی شجاع آباد جاتی ہوں۔ مکاں تو واپس آنہیں سکتا۔ مگر کلیجہ تو ٹھنڈا ہو سکتا ہے"!

بڑھیا کمر پہ ہاتھ رکھے، جوتی چٹخاتی آگے کو روانہ ہوئی۔ مگر جلال پور کی سڑک پر نہیں۔ بلکہ اس بڑی شاہراہ پر جو دنیا پور سے شجاع آباد کو جاتی تھی۔ ابّن کچھ دیر کھڑا ان کو دیکھتا رہا۔ پھر روآنی کو چل دیا۔

اسے نورنگ خان سے یہ رنج تھا۔ کہ جب سے یہ شہر آباد ہُوا تھا۔ اُسے لوٹ مار کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ ایک آدھ دفعہ چوری کے جرم میں خانِ اعظم سے سزا بھی پا چکا تھا۔ اب یہ چاہتا تھا۔ کہ کسی طرح خانِ اعظم یہاں سے واپس شجاع آباد

چلا جائے۔ تاکہ حسب دستور پھر لوٹ مار کر سکے۔

نواب محمد شجاع خاں کے عدل و انصاف کا دنیا بھر میں شہرہ تھا۔ وہ مظلوم کے لئے ہی "شجاع" نام لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس لئے کسی شخص کو جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ کہ کسی حقیر سے حقیر شخص پر آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے۔

"ابّن" کو امید تھی۔ کہ اگر بڑھیا اُس کے دربار میں چلی گئی۔ تو نورنگ خاں آسانی سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا۔ اس لئے صبح سویرے اپنے کئی کام چھوڑ کر اس کے تعاقب میں بھاگا تھا

شجاع آباد

شجاع آباد کوٹ نورنگ سے چودہ میل پڑتا تھا۔ اگر انتقام کا جوش بڑھیا کی شریانوں میں خون کو نہ گرما دیتا۔ تو غالباً وہاں تک پہنچنے کی اُسے ہمت نہ ہوتی۔ باوجودیکہ سواری میسّر نہ تھی۔ اور کوئی ساتھی بھی ہمراہ نہ تھا۔ لیکن بڑھیا نے حوصلہ نہ ہارا۔ دونو چلتے رہے۔ رات بستی میں پڑی۔ اور دوسرے دن دوپہر کو نالہ گجرہٹہ کے پُل پر تھے۔ بڑھیا نے بڑبڑا کر کہا۔

یہ نالہ بھی ابھی بنا ہے۔

چند قدم آگے چلے تھے۔ کہ رامون حیرت سے چلا اٹھا۔ آہا شہر آگیا۔ ماں! دیکھو تو سہی کتنا سندر اور کتنا بڑا شہر ہے آخر آ ہی گئے نا۔ بڑھیا نے چہرے کی خاک دھول دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے کہا "ہاں دیکھ بڑی چستی سے جواب دینا۔ بادشاہ بڑا عادل ہے۔ غریبوں کی خوب سنتا ہے" بڑھیا نے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ایسا جواب دوں گا۔ کہ نواب کانپ اٹھے گا"

"بھلا کیا کہو گے" بڑھیا رک گئی۔ اور گھور گھور کر لڑکے کو دیکھنے لگی۔

میں کہوں گا راجن میرا انصاف کر۔ میں یتیم ہوں۔ لاوارث ہوں۔ میری ماں بھی بڑھیا ہے ہمارا کوئی سہارا نہیں۔ لیکن تو جانتا ہے۔ کہ جس کا کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ اس کا سہارا خود خدا بن جاتا ہے"

"کیوں ٹھیک ہے ماں؟"

"شاباش! بہت اچھا جواب ہے"

شہر کی عورتیں گھاٹ سے نہا دھو کر شہر کو لوٹ رہی تھیں ان کے ساتھ دونو بڑھتے چلے گئے۔ کہیں کہیں رامون نواب

زادوں کی خوشنما کوٹھیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ٹھیر جاتا تھا۔ بڑھیا چند قدم چل کر رُک جاتی اور جب راموں آجاتا۔ تب آگے چلتی۔ شہر کی کوہ وقار فصیل کے قریب پہنچے۔ تو اس کے باہر کی طرف چوڑی خندق پانی سے بھری ہوئی نظر پڑی۔ بڑھیا نے راموں کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔ اور کہا دیکھنا اس کے قریب نہ جانا یہ بہت گہری ہے۔ ہر وقت اس میں نہر گجوہٹہ سے پانی آتا رہتا ہے۔ اس لئے پانی ہمیشہ صاف ستھرا رہتا ہے۔ بڑھیا یہ کہہ کر سر بفلک دروازے کی طرف لپکی۔ اور بازار سے گذرتی ہوئی چوک میں جا پہنچی۔ یہاں رُک کر راموں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ چاروں دروازے نظر آرہے تھے۔ بازاروں میں اتنی بھیڑ تھی۔ کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ دوکانیں خوب آراستہ تھیں۔ درمیان میں ایک جانب سبزمنڈی تھی۔ مغرب کی طرف کپڑوں کی دوکانیں تھیں۔ شمال کی سمت شہر کی جامع مسجد اور حلوائیوں کے خوانچے لگے تھے۔ بڑھیا نے دامن سے دونی کھول کر راموں کو رنگترے لے دیئے۔ یہاں سے بڑھیا نے دربار کا پتہ دریافت کیا۔ ایک پیرمرد نے آگے بڑھ کر کہا۔

آ بہن! میں تجھے سرکار کی کچہری میں پہنچا دوں۔ بڑھیا دعائیں دیتی ساتھ ہولی۔ کچھ دُور جا کر ایک عالیشان عمارت آئی۔ یہاں لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ پیر مرد نے کہا۔ یہ نواب صاحب کا دربار ہے۔ دروازے سے گذر کر اندر چلے جاؤ۔ چوبدار تمہیں خود بخود سرکار کی خدمت میں پیش کر دے گا۔

نواب کا دربار

بڑھیا نے دروازے سے گزر کر اِدھر اُدھر جھانکا۔ لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ راموں کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے بولی۔ دیکھو بیٹا! اتنی بھیڑ میں ہماری کون سُنتا ہے۔ ذرا قریب لگ کر بیٹھ جاؤ۔ جب ذرا ہجوم کم ہوگا۔ تب آگے چلیں گے۔ ایک آدمی جو پاس کھڑا تھا۔ بولا" مائی! اب فریادی پیش ہیں۔ تم بھی ساتھ ہو جاؤ گھنٹہ بھر تک ظہر کی نماز کے لئے دربار برخاست ہو جائے گا۔ اور تمہیں پھر کل کے لئے ٹھہرنا پڑے گا۔

چوبدار شاہی نے آگے بڑھ کر راموں کا ہاتھ تھاما۔ بڑھیا

سے کہا ماں ! ادھر آؤ ۔ مردوں میں مت ٹھہرو ۔ میں تمہیں کٹہرے کے قریب لے چلتا ہوں ۔

نواب کی گرجدار آواز آرہی تھی ۔ راموں سہم گیا کہنے لگا ۔ اماں ! ڈر لگتا ہے "۔

" ڈر کا ہے کا کوئی ہم چور ہیں !" بڑھیا نے راموں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا ۔ چوبدار بڑھیا کی ضعیفی پر رحم کھا کر اسے نواب کے بالکل سامنے لے گیا ۔

محمد شجاع خاں پچپن ۵۵ برس کا بارعب انسان تخت شاہی پر بیٹھا داد انصاف دے رہا تھا ۔ اس کی مسکراہٹ کی بے خطا کشش لوگوں کے دلوں کو موہ لیتی تھی ۔ اور موٹی موٹی آنکھوں سے جاہ و جلال ٹپکتا تھا ۔ کہ بڑے بڑے امرا کانپ اٹھتے تھے ۔ نواب نے کمسن راموں اور اس کی ضعیف ماں کو دیکھا ۔ تو ملائمیت سے پوچھا " اے بچے ! بول کیا چاہتا ہے ؟"

راموں نے جھک کر پرنام کیا ۔ اور ادب سے بولا

" سرکار میں انصاف چاہتا ہوں ۔ میں یتیم ہوں ، لاوارث ہوں میری ماں بھی بڑھیا ہے ۔ میرا کوئی سہارا نہیں ۔ لیکن اے راجن تو جانتا ہے ۔ کہ جس کا کوئی سہارا نہیں ہوتا ۔ اس

کا سہارا خود خدا بن جاتا ہے۔ اگر تو نے میرا انصاف نہ کیا۔ تو پھر میرا اور تیرا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔ بھگوان جو کرے گا وہ ہر حالت میں ہمارے لئے بہتر ہو گا۔"

راموں ہانپنے لگا۔ اس کی نگاہیں نواب کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ نواب منہ میں انگلی دبائے راموں کے جواب پر تعجب کر رہا تھا۔ راموں کو قریب بلا کر کہا۔

"بیٹے! تم بہت دکھی معلوم ہوتے ہو۔ صاف صاف بیان کرو۔ تم پہ کیا ظلم ہوا ہے؟"

مجھ پر کیا ظلم ہوا ہے؟ یہ میری ماں سے پوچھیئے! راموں نے ماں کو آگے دھکیلتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا ہے مائی!" نواب کی آواز پھر گونجی

بڑھیا نے لاٹھی کو سہارا دے کر دونو ہاتھوں سے نواب کو پرنام کیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اے راجن! سنتے آئے ہیں بادشاہوں کو رعایا اولاد سے بھی پیاری ہوتی ہے۔ میں بھی تمہاری لاوارث رعایا ہوں۔ تیرے بھائی نورنگ خاں نے میرا مکان چھین لیا۔ مجھے اور میرے یتیم بچے کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ میری پونجی، میرے

یتیم راموں کا اثاثہ گھر میں ڈال لیا۔ وہ جھونپڑا جس میں ہم ماں بیٹا بیٹھ کر سستایا کرتے تھے۔ اب زمین کے برابر ہو چکا ہے۔ اے بادشاہ تیرے راج میں ہم بے کسوں کے لئے نہ گرمی سے بچنے کا کوئی چھپر باقی رہا ہے اور نہ سردی سے بچنے کا کوئی جھونپڑا۔"

بڑھیا دفورِ غم سے رونے لگی۔

نواب نے شرم سے سر جھکا لیا۔ اور کہا "مائی افسوس ہے۔ میرے بھائی نے تجھے تکلیف پہنچائی۔ مجھے معاف کردو۔ اور دیکھو پھر میرے بھائی کو رسوا بھی نہ کرنا میں ایسا فیصلہ کرونگا۔ کہ دنیا عبرت پکڑے گی۔ مگر جانتی ہو۔ نورنگ اور شجاع کی عزت ایک ہے۔ میں اس کے خلاف تیری زبان سے ایک لفظ بھی نہ سنوں!"

یہ کہہ کر وزیر اعظم کو قریب بلایا۔ اور فرمایا۔ کیا پرچہ نویس کی رپورٹ اس بارے میں نہیں آئی؟"

"آچکی ہے عالم پناہ" وزیر اعظم نے چند لمحات کے اندر مطلوبہ رپورٹ نواب صاحب کی خدمت میں پیش کردی۔ پرچہ نویس کا ایک ایک لفظ بڑھیا کی تائید کرتا تھا۔ نواب نے سر اٹھا کر

بڑھیا سے خطاب کیا۔

"بہن! تم درست کہتی ہو۔ مگر خان اعظم نے دو سو بیگھے زمین بھی تو دینی کی ہے نا"

جی ہاں سرکار۔ مگر راموں راضی نہ ہوا۔ نادان جو ٹھہرا۔

نواب نے مسکرا کر راموں سے پوچھا "کیوں بچے! تیرا جھونپڑا دو سو بیگھے سے بھی زیادہ قیمتی تھا؟"

"مگر کوئی باپ دادا کی چیز بھی بیچتا ہے؟ میں کوئی دیوالیہ تھا کہ باپ کا مکان بیچتا!"

راموں ٹھیک کہتا ہے نواب نے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "اے بڑھیا! گرا ہوا مکان تو دوبارہ نہیں مل سکتا۔ اگر کہو تو شجاع آباد میں اس سے بدرجہا بہتر اور مکان بنوا دوں۔

اور مکان اچھا لگتا۔ تو بھائی کے پاس ٹھٹھہ میں جا کر نہ بنوا لیتی!

تو پھر میرا شیش محل ہی لے لو۔ اس پر میرا اڑھائی لاکھ خرچ آیا ہے۔ میں اسی وقت دینے کو تیار ہوں۔ بشرطیکہ تم دعوی سے دستبردار ہو جاؤ"

بڑھیا دیوانوں کی طرح کھل کھلا کر ہنسی۔ کہا:

مہاراج! ہر چیز کو اپنا آشیانہ پیارا ہوتا ہے۔ اگر شیش محل اڑھائی لاکھ کا ہے تو تیرے لئے۔ میرے کس کام کا۔ میں تو وہی تنگ و تاریک جھونپڑا مانگتی ہوں۔ اگر واپس لا دو۔ تو میرا راضی نامہ ہو سکتا ہے ورنہ جس ظالم نے میرا مکان گرایا ہے تم اس کا مکان گرا دو!"

"کیا اس سے تمہارے انتقام کی پیاس بجھ جائے گی؟"

ہاں اگر بدلے کا بدلہ مل جائے گا۔ تو پھر کاہے کو نہ بجھے گی۔

نواب سنبھل کر تخت پر سیدھا ہو بیٹھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس نے دل میں کوئی قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔ کہا

اے خاتون! ہم نے تیری فریاد کو سُنا۔ اگلے جمعہ کو سیّد فتح اللہ شاہ صاحب کی خانقاہ پر میلہ ہے۔ وہاں ہمارا دربار لگے گا۔ تمہارے مقدمہ کا فیصلہ بھی وہیں ہو گا۔

میلہ پیر فتح اللہ شاہ

پیر فتح اللہ شاہ صاحب اپنے عہد کے باکمال درویش تھے۔ ایک مسقف چبوترے پر دو پراسرار صندوق رکھے تھے۔ لوگوں میں مشہور تھا۔ کہ ان میں سے کسی ایک میں آپ کی نعش بند ہے۔

پیر صاحب کی یادگار ہر سال منائی جاتی تھی۔ لودھراں۔ گوگڑاں۔ ٹھٹھہ۔ بہاول پور۔ جلال پور اور شجاع آباد تک سے ہزاروں ہندو مسلمان بلاتفریق مذہب وملت اس میلے میں آکر شریک ہوتے تھے۔ خود نواب صاحب بھی بنفسِ نفیس تشریف لاکر یہاں دربار لگاتے تھے۔ رعایا کو عام اجازت تھی۔ کہ جو چاہے اپنے بادشاہ سے ملے۔ اور جو درخواست گزارنا چاہے۔ بلاوسیلہ خود پیش کرے۔ چنانچہ آج بھی وہی تقریب تھی۔ گردو نواح سے بڑے بڑے طومان دار اور رؤسا جمع ہو رہے تھے۔ مسجد کے سامنے لمبے چوڑے میدان میں وسیع شامیانہ نصب تھا۔ دن ڈھلے نواب صاحب نے خود نماز پڑھائی۔ اور پھر دربار منعقد ہُوا۔

ڈھنڈورچی نے پکار پکار کر اعلان کیا۔ کہ جس کسی کو طومان دار یا کسی جاگیردار کے خلاف کچھ شکایت ہو۔ حضور میں عرض کرے۔ غول کے غول جن میں کئی فریادی تھے۔ اور کئی تماشائی۔ شامیانے کی طرف متوجہ ہوئے۔

نواب صاحب نے پہلے پیر فتح اللہ شاہ صاحب کی پاکیزہ زندگی پر مجمل سی تقریر کی۔ اور لوگوں کو بتایا۔ کہ جو دنیا میں خلق خدا کے لئے زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی اس طرح حانقاہیں بنتی

ہیں لوگ ان کی یادگاریں مناتے ہیں۔ ہمیں اور تمہیں سب کو
پیر صاحب کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ پھر کہا کہ خدا کو
حاضر ناظر جان کر اپنی شکایات پیش کرو۔ اگر کسی نے ہمارے
حضور میں جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔ پہلے تو یقین ہے کہ
اس کے جھوٹ کا بھانڈا یہیں پھوٹ جائے گا اور اگر مکروفریب
سے وہ ہمیں دھوکہ دینے میں کامیاب ہو بھی گیا۔ تو آخرت کی
روسیاہی سے کیسے بچ سکتا ہے!"

اب فریادی پیش ہونے شروع ہوئے۔ مجرموں کو خواہ وہ
کتنے بڑے رتبہ کے کیوں نہ تھے۔ بر سر دربار سزا دی گئی۔
بعض کو جرمانہ ہوا۔ بعض کو تازیانے لگے۔ اور بعض کو فوراً گرفتار
کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اب رامون پیش ہوا۔ نواب نے
اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اور گرج کر کہا "خانِ اعظم نورنگ خان
کہاں ہیں؟"

ایک آدمی نے بڑھ کر کہا۔ حضور وہ سخت بیمار ہیں۔ ان
کی حالت اس قدر تشویشناک ہے۔ کہ ان کے صاحبزادے
بھی اس دربار میں شریک نہیں ہو سکے۔

نواب نے اپنے جواں سال فرزند مظفر خان کو طلب کیا۔

تیس سال کا جوانِ رعنا پیش ہُوا۔

"ذرا قریب آنا مظفر!"

مظفرخان بالکل قریب ہوگیا۔ نواب نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا" دیکھو! میں کوٹ نورنگ جاکر تمہارے چچا کو معہ اہل و عیال اور مال و اسباب شجاع آباد روانہ کرتا ہوں۔ تم گھر پہنچ کر قندھاری محل کو فارغ کرو۔ اور اُسے سامان سے خوب آراستہ کرو۔ جب مہمان پہنچیں۔ انہیں اس محل میں اُتارو۔ دوسرا محل جو اس کے متصل واقع ہے۔ اس میں ان کا سامان قرینہ سے رکھواؤ۔ مگر یہ کام اس رازداری سے انجام پائے۔ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوسکے۔

ہاں! ہوا ہو جاؤ۔ مظفرخان نے ادب سے سر جھکا کر باپ کو سلام کیا۔ اور گھوڑے کو ایڑ لگا یہ جا وہ جا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

اب نواب نے سواری طلب کی۔ فوراً شبدیز پیش کیا گیا۔ نواب صاحب سوار ہوکر شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ کوٹ نورنگ کو روانہ ہوئے۔

نواب کی غیر متوقع آمد

نورنگ خان کو نواب کی طبیعت کا پورا اندازہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر بڑھیا نے میرے خلاف استغاثہ دائر کیا۔ تو مجھے بھی عوام کی طرح برسرِ اجلاس سزا ملے گی۔ اس لئے وہ جھوٹ موٹ بیمار پڑ گیا تھا۔ مگر شرم و ندامت اور خوفِ پرسش نے اُسے سچ مچ بیمار کر دیا۔ اب واقعی اُسے خونی اسہال آنے لگے تھے لڑکوں میں اتنی ہمت کہاں تھی۔ کہ تن تنہا نواب صاحب کے حضور میں پیش ہوتے۔ اس لئے ڈر کے مارے کوئی بھی میلے پر نہ گیا۔

عصر کے قریب غُل اُٹھا۔ کہ نواب صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ اس وحشتناک خبر نے اور بُرا اثر کیا۔ نورنگ خاں سخت نڈھال ہو گیا۔ مگر اس کمزوری کے باوجود پل پل کی خبریں منگوا رہا تھا۔ دوسری اطلاع پہنچی کہ سرکار کی سواری شہر کے قریب بھی آ پہنچی۔ خانِ اعظم نے چلّا کر کہا۔ ایوب خاں! بھائیوں کو لے کر استقبال کو پہنچو۔ کھڑے کیا دیکھتے ہو۔ جاؤ بھی۔!"
سارے بھائی گھوڑوں پر سوار ہو کر پیشوائی کو روانہ ہوئے۔

ملازمین نے دیوانِ عام، دیوانِ خاص اور دیگر محلات کو آراستہ کرنا شروع کیا۔ گلی کوچوں میں سقّے چھڑکاڈ کرنے لگے۔ میر مطبخ نے کئی بکرے اور مرغے ذبح کرڈالے۔ ہر شخص مستعدی سے اپنا اپنا ذمّہ کام انجام دینے لگا۔ اور وہ کوٹ نورنگ جو چند ساعت پہلے سنسان پڑا تھا۔ اب اس میں چہل پہل اور گھما گھمی سے کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔

نواب صاحب نے بھتیجوں کو دُور سے دیکھتے ہی خندہ پیشانی سے سلام کیا۔ ایوب خاں فوراً گھوڑے سے اُتر پڑا۔ باقیوں نے بھی اُتر کر گھوڑے ملازموں کے حوالے کئے۔ اور سب پیدل روانہ ہوئے۔ نواب نے ہر ایک کے کندھے پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ اب یہ شاہانہ جلوس مسجد جامع کے قریب پہنچ چکا تھا۔ نواب نے گھوڑے سے اُتر کر سب کے ساتھ مغرب کی نماز ادا کی۔ اور پھر محل سرائے کو روانہ ہوئے۔

خانِ اعظم نورنگ خان بیماری کے باوجود لاٹھی کے سہارے چل کر دروازے تک پیشوائی کو حاضر ہُوا۔ دونو بھائی بغلگیر ہو کر ملے۔ نواب صاحب دونو ہاتھوں سے نورنگ خاں

کو تھام کر بستر تک لے آئے۔ اور دیر تک اس اچانک بیماری کا افسوس کرتے رہے۔ نواب صاحب کی دو بیٹیاں یہاں بیاہی ہوئی تھیں۔ اور بڑی دیر سے شفیق باپ اور مہربان بھائیوں کی راہ تک رہی تھیں۔ حاضر ہو کر قدمبوس ہوئیں۔ نورنگ خان کی باقی بہو بیٹیوں نے بھی شرفِ نیاز حاصل کیا۔ نواب نے خزانچی سے زیورات کا صندوق منگوا کر محل کی چھوٹی بڑی سب صاحبزادیوں کو طلائی ہار مرحمت فرمائے۔ اور کہا:-

خان بی بی تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ عرصہ سے تم اُن کو ملنے نہیں گئیں اب میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ تیاری کر لو۔ صبح سویرے ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ رات کو بھائی سے کہا۔ آپ کی یہ حالت ہو گئی۔ اور مجھے اطلاع تک نہ دی۔ اِدھر میں ایک ضعیف آدمی اور اتنی بڑی سلطنت کا بوجھ۔ بہتر یہ ہے کہ زندگی کے باقی ایام مل کر گذاریں اور رعایا کے درمیان جو حجاب ہوتا ہے۔ اس کے باعث نہ وہ مجھے غلطی پر متنبہ کر سکتے ہیں۔ اور نہ ملکی معاملات میں کوئی صائب رائے پیش کر سکتے ہیں۔ میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ بھائی اور بھتیجوں کو ہی لے آؤں تاکہ حکومت کے معاملات

بلیں وہ میرا ہاتھ بٹائیں ۔ اور میں کما حقہٗ اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکوں ۔

نورنگ خاں زمانے کا سرد و گرم چشیدہ اور گرگ باراں دیدہ ہی تو تھا ۔ اصل کیفیت تاڑ گیا ۔ مگر وضعداری کو قائم رکھتے ہوئے بولا :۔

سرکار کی عین کرم فرمائی ہے ۔ کہ غلام کو دشت غربت سے نکال کر پھر اپنے کلیجہ میں جگہ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ اس کا میں کہاں تک شکریہ ادا کروں ۔

زبان یہ لفظ ادا کر رہی تھی ۔ مگر دل میں چھریاں چل رہی تھیں ۔ آخر رہا نہ گیا اور آنکھ سے پیارے شہر کی یاد میں ایک گرم گرم آنسو بہ نکلا ۔

تباہی و بربادی

نواب صاحب "پیر فتح اللہ" سے ہی یہ تہیہ کر کے آئے تھے ۔ کہ نورنگ خان کو بمعہ اہل و عیال کے شجاع آباد لے جانا ہے ۔ اس لئے سواری کے اونٹ گھوڑے ہمراہ لے کر آئے تھے ۔ اور یہاں بھی اصطبل میں کسی چیز کی کمی نہ تھی علی الصباح

مستورات کو محملوں میں سوار کرا کے ایوب خان اور نصرت خاں کی ہمراہی میں شجاع آباد روانہ کیا۔ پھر نورنگ خان کو اپنے تخت رواں میں لشکران کے پیچھے پیچھے رخصت کیا۔ غضنفر خان بھی بار برداری پر مامور تھا۔ خانِ اعظم کا کل سامان حتّٰی کہ ان کے مطبخ کی لکڑیاں بھی اونٹوں پر لدوا لی گئیں۔ جب سورج نے طلوع کیا۔ تو "کوٹ نورنگ" تصویرِ حیرت بنا خاموشی سے ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔

نواب کا غصہ ابھی فرد نہ ہُوا تھا۔ اس نے بڑھیا کو طلب کیا اور کہا۔

"اے نیک بخت! نورنگ خان نے تجھ سے ایک جھونپڑا چھینا تھا۔ مَیں نے اُس سے یہ سارا شہر چھین لیا۔ اُس نے تیرا ایک مکان گرایا تھا۔ مگر دیکھ میں اس کے فلک بوس محلات سے کیا سلوک کرتا ہوں"

اُسی وقت حکم دیا، کہ سوائے دیوان عام اور مسجد جامع کے نورنگ خاں کے تمام محلات کو گرا دیا جائے۔ راج مزدور جو سالہا سال سے ان فردوس نما عمارات کو بناتے آئے تھے۔ اب انہی ہاتھوں سے اس جنت ارضی کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔

بالآخر سارا قلعہ مسمار ہو گیا۔ صرف دیوانِ عام درمیان میں دم بخود کھڑا دیدۂ عبرت سے آنسو بہا رہا تھا۔ نواب نے کہا

" اے بڑھیا افسوس کہ ہم تیرا مکان نہیں دلا سکے۔ مگر کوٹ نورنگ کا سارا رقبہ تیرے حوالے کرتے ہیں۔ یہ کچہری کی عمارت ہے۔ اسے اپنے تصرف میں لا۔ اور باقی ملبہ سے جس طرح چاہے اپنے اور اپنے ہمسایوں کے لئے مکان بنوا۔ مگر نورنگ خان کو معاف کر دے " یہ کہہ کر نواب نے گھوڑے کی باگ اٹھائی۔ اور رفقا سمیت شجاع آباد کو روانہ ہو گیا۔

شام کو جب سورج اپنی زرد زرد کرنیں کوٹ نورنگ کے کھنڈرات پر نچھاور کر کے رخصت ہونے لگا۔ تو اس نے دیکھا۔ کہ راموں اور اس کی بڑھیا ماں کچہری کے سامنے مٹی کے ڈھیر پر بیٹھے رو رہے ہیں۔ اور " اتن " پاس کھڑا مسکرا رہا ہے۔

اے بادشاہ!
تو
کہاں ہے؟

"اے بادشاہ! تیری بدقسمت رعایا جان بچانے کے لئے تیری طرف دوڑی۔ مگر کرشنا کے حبیب افعی نے اُسے تیرے قدموں تک نہ پہنچنے دیا۔ انہوں نے دشمنوں کے مقابلہ میں دریا کی لہروں کو ترجیح دی۔ وہ اس بحرِ قہار میں کود پڑے۔ بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر اس کی خوفناک موجوں سے زندہ وسلامت نہ بچ سکے۔ جب میں کرشنا سے نکل کر ادھر کو روانہ ہُوا۔ دریا کی پرشور موجوں میں ڈوبنے والوں کی پکار برابر سنائی دے رہی تھی۔ کہ اے بادشاہ تو کہاں ہے؟

"ایک سپاہی"

(۱)

فیروز شاہ بہمنی کو شکار سے شغف نہیں بلکہ عشق تھا۔ ہفتے میں دو بار خاصہ فوج کے جان باز ہمراہ لے پچھلی رات کو دارالحکومت سے نکلتا۔ اور پٹن کے مضافات میں شکار کھیل کر پہر دن چڑھے واپس آکر دربار لگاتا تھا۔ اگرچہ بظاہر اس معمول سے غرض تفریح تھی۔ مگر حقیقت میں شکار محض بہانہ تھا۔ مقصود اس سے فوج کو حرب ضرب کے لئے تیار رکھنا تھا۔

سنہ ۱۸۰۱ء میں سلطان شکار کے لئے گلبرگہ سے روانہ ہوا۔ بارہ ہزار جاں نثار جن کے سروں پر جواہر نگار فولادی خود عجب بہار دے رہے تھے۔ ہمرکاب تھے۔ اور احمد خاں سپہ سالار دائیں پہلو میں تھا۔ دونو بھائی[1] آپس میں باتیں کرتے گھوڑے اڑائے چلے جاتے تھے۔ کہ پٹن کے قریب لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک

[1] احمد خان سپہ سالار سلطان کا چھوٹا بھائی تھا۔

گئے۔ معلوم ہوا۔ دریا پار سے کوئی سپاہی زخمی ہوکر آیا ہے اور پڑا دم توڑ رہا ہے۔ بادشاہ جست لگا کر گھوڑے سے اترا۔ قریب جا کر دیکھا۔ کہ ایک مسافر فوجی لباس میں زمین پر چت لیٹا ہے۔ کپڑے خون سے لت پت ہو رہے ہیں۔ اتنے میں لشکر سلطانی آ پہنچا۔ معالج شاہی نے زخموں کو دھو کر مرہم کے پھائے رکھے۔ اور منہ میں "آب حیات" کے چند قطرے ٹپکاتے سپاہی نے آنکھیں کھول دیں۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے شہنشاہ کو دیکھنے لگا۔ گویا وہ سوچ رہا تھا۔ کہ یہ عالم خواب ہے یا حالتِ بیداری۔

بادشاہ سپاہی کے پاس بیٹھ گیا۔ شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اور نرمی سے بولا "میرے بہادر بول تجھے کس بدبخت نے زخمی کیا؟" سپاہی رو پڑا۔ اور بادشاہ کے قدموں سے آنکھیں ملتے ہوئے بولا "میں کیا کہوں عالم پناہ! کہتے ہوئے زبان لرزتی ہے۔ میرے آقا۔ دریا پار کی تیری ساری رعایا کٹ چکی۔ مدکل اور رائچور تباہ کر دئے گئے!!" سپاہی کمزوری کے سبب بولتے بولتے رُک گیا۔ اور ملتجیانہ نگاہوں سے بادشاہ کو دیکھنے لگا۔

سلطان نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "میرے مظلوم بیٹے کہے جا!"
اور پھر ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولا "آہ میری غریب رعایا!"
سپاہی نے اپنی ساری قوت کو صرف کر کے بولنا شروع کیا۔
"اے بادشاہ تیری بدقسمت رعایا جان بچانے کے لئے تیری طرف دوڑی۔ مگر کرشنا کے مہیب افعی نے انہیں تیرے قدموں تک پہنچنے نہ دیا۔ اس نے دشمنوں کے مقابلے میں دریا کی لہروں کو ترجیح دی۔ تیرے جاں نثار اس بحرِ قہار میں کود پڑے۔ بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر اس کی خوفناک موجوں سے زندہ وسلامت نہ بچ سکے۔ جب میں کرشنا سے نکل کر اِدھر کو چلا آتا تھا۔ دریا کی پُرشور موجوں میں ڈوبنے والوں کی پکار برابر سُنائی دے رہی تھی۔ کہ "اے بادشاہ تو کہاں ہے؟"
بادشاہ کا چہرہ غصہ سے لال پیلا ہو گیا۔ اور رنج وغم سے دانت پیستے ہوئے بولا
"بدبخت دیو راۓ! اپنے بزرگوں کی بدنامیوں اور رسوائیوں کو بھول گیا۔"
پالکی منگوا کر سپاہی کو اس میں آرام سے لٹایا۔ اور چند ملازم ساتھ کر کے دارالحکومت کو روانہ کیا۔ پھر کرتا ہاتھ میں لے کر

اس زنّاٹے سے پھونکی کہ جنگل گونج اُٹھا۔ تمام فوج ایمانی تلواریں ہاتھ میں لے کر حکم شاہی کا انتظار کرنے لگی۔ دفعتہً بادشاہ کی بارعب آواز بلند ہوئی۔

"میرے وفادار دوستو۔ ہم جنگلی ہرنوں کا شکار کرنے آئے تھے مگر قضا و قدر نے بیجا نگر کے درندوں کو بھیج دیا۔ اب اُن سے منہ موڑ کر پیچھے لوٹنا جوانمردی کا منہ کالا کرنا ہے۔ اس لئے جس کو سوچنا ہے وہ سوچ لے۔ اور جس کو حقِ نمک ادا کرنا ہو۔ وہ ہمارے پیچھے گھوڑا سرپٹ ڈال دے۔"

یہ کہہ کر سلطان لپک کر "شبدیز" پر سوار ہو گیا۔ اور اُسے ایڑی لگا، ہفتوں کی منزلوں کو لپیٹ تیسرے دن کرشنا کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ پیچھے مُنہ پھیر کر دیکھا تو ساری فوج مرنے مارنے کو کمربستہ پائی۔

دریا کالے ناگ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اور پار دیورائے کی فوج ناکہ بندی کے لئے پڑی تھی۔ سلطان گھوڑے سے اُتر کر سپہ سالار کے ہمراہ پہاڑی پر چڑھ گیا۔ چوٹی پر جا کر دیکھا۔ تو کرشنا اس سرعت سے بہتا نظر آیا گویا پہاڑوں کو بھی کاٹ کر بہالے جائے گا۔ اور پھر پاٹ میلوں تک پھیل رہا تھا۔

بادشاہ کا دل ڈوب گیا۔ اور افسردہ خاطر ہو کر نیچے اُترنے لگا۔ پیادے چند ملاحوں کو گرفتار کر لائے تھے۔ اور اُن سے دشمن کی فوج کا پتہ کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ دیو راۓ نو لاکھ اور تیس ہزار سواروں سے کئی میلوں میں کیمپ لگائے پڑا ہے۔ اور سامان اس قدر ہمراہ لایا ہے۔ کہ اگر پانچ سال بھی یہیں گزارنے پڑ جائیں۔ تو اور منگوانے کی ضرورت نہ پڑے۔ اس خبر سے فیروز شاہی اُمراء کے اوسان خطا ہو گئے۔ عالم خاں افغان نے گھبرا کر کہا:۔

"جہاں پناہ! اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ لشکر سلطانی کا ایک ایک سپاہی دس دس کھتریوں پر بھاری ہے۔ مگر یہاں تو ایک کے مقابلے میں ایک سو سپاہی پڑا ہے۔ اور پھر ہاتھیوں اور توپوں کی مار الگ ہے۔ ساتھ ہی کرشنا کی طغیانی کا یہ عالم ہے کہ سوائے اس گھاٹ کے اور کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آتی۔ جہاں سے فوج گذر سکے۔ ایسے حالات میں اتنے خوفناک دشمن سے ٹکر لینا جان بوجھ کر موت کے منہ میں جانا ہے!"

سلطان نے کہا "یہ سب درست ہے۔ مگر مسلمانوں نے دشمنوں کی کثرت پر کبھی غور نہیں کیا۔ اور قرآن حکیم کا یہ ارشاد

ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا ہے۔ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللهِ ـ وَاللهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ○ اگر مٹھی بھر مسلمانوں سے طارق اندلس کے لاکھوں نبرد آزما سپاہیوں کو شکست دے سکتا ہے اور اگر عرب کا سترہ سالہ جرنیل محمد بن قاسم چند ہزار شامیوں سے داہر کی بے قیاس افواج کا قلع قمع کر سکتا ہے۔ تو نیروز بھی بارہ ہزار جان بازوں سے دلور اٹے کا خاتمہ کر سکتا ہے"!

احمد خاں نے دست بستہ عرض کیا۔ ظل اللہ کا ارشاد بجا مگر طارق اور ابن قاسم کی فوجیں ہزاروں میل گھر سے دور تھیں۔ ان کو تخت یا تختہ کے سوا اور کوئی صورت نظر نہ آسکتی تھی۔ اس لئے انہوں نے ذلت کی موت پر شہادت کی عزت کو پسند کیا۔ اور کامیاب ہوئے۔ مگر یہاں ہر شخص گھر کے قریب پڑا ہے۔ اور وہ جانتے ہیں کہ بھاگ کر جان بھی بچائی جا سکتی ہے۔ پھر اس دفعہ طغیانی کا یہ عالم ہے۔ گویا مالا بار کے تمام پہاڑ پگھل کر اسی دریا میں بہہ رہے ہیں۔ یا مون سون ہواؤں نے بحیرہ عرب کو اٹھا کر کرشنا میں دے ٹپکا ہے"!

میاں سدھو بڑھ کر بولے" بہتر یہ ہے کہ ہم اسی طرح دشمن کا رستہ روکے پڑے رہیں۔ وہ کسی طرح کرشنا کو عبور نہیں کر سکتا۔

اور اگر اس نے جرأت کی بھی تو اس کا کوئی متنفس زندہ اس کنارے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس اثنا میں تمام مملکت میں پروانے بھیج کر کمک منگوائی جا سکتی ہے۔ زیادہ نہ سہی مگر نو لاکھ کے مقابلہ میں ایک لاکھ جاں نثاروں کا ہونا تو نہایت لازمی ہے۔"

بادشاہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ جب سے میں نے مدگل اور رائچور کی تباہی کی داستان سُنی ہے۔ اس وقت سے رات کی نیند اور دن کا آرام مجھ پر حرام ہو چکا ہے۔ جب سونے لگتا ہوں۔ مظلوم رعایا خواب میں آکر مجھ سے فریاد کرتی ہے۔ اور اس کی یہ صدا " اے بادشاہ تو کہاں ہے؟" آٹھوں پہر میرے کانوں میں گونجتی رہی ہے۔ اس لئے کسی صورت میں بھی آپ صاحبان کا مشورہ میرے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ہاں واپس جانے کی ہر شخص کو اجازت ہے۔

یہ کہہ کر سلطان نے امرائے دربار پر افسردہ نگاہوں سے نظر ڈالی اور اپنے خیمہ میں داخل ہو گیا۔

قاضی سراج احمدؒ جو دربار کے بہت بڑے عالم اور گلبرگہ

کے چیف جسٹس تھے۔ اب تک خاموش کھڑے اُمرائے لشکر کی تقریریں سُن رہے تھے۔ جب بادشاہ چلا گیا۔ تو انہوں نے احمد خان خانخانان سے کہا۔

آپ نے یہ بہت بُرا کیا۔ کہ سلطان کو ناراض کر دیا۔ اُس کے تیور بتا رہے ہیں۔ کہ وہ دیو رائے سے جنگ کئے بغیر کبھی نہ لوٹے گا۔

احمدؔ خاں نے آشفتہ ہو کر کہا۔

"عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر زید بکر کو توپ دم کرا دینا آسان ہے۔ لیکن میدان جنگ کی گتھیوں کو سلجھانا بہت مشکل۔ اگر دعویٔ جوانمردی ہے۔ تو کچھ کر کے دکھائیے!"

قاضی صاحب نے ہنس کر کہا۔ دُعا کیجئے۔ ممکن ہے کہ مسندِ قضا پر بیٹھنے والوں سے بھی کوئی ایسی خدمت انجام پا جائے۔ جو بڑے بڑے شیرِ دل سپہ سالار بھی انجام نہ دے سکیں۔ ؎

گاہ باشد کہ کودکے ناداں
زغلط بہدف زند تیرے

یہ کہہ سیدھا بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ سلطان

کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ آہٹ پا کر آنکھ اُٹھائی ۔
قاضی صاحب کو دیکھ کر فرمایا ؎

طبیبا یکے دفترِ خویش بگشا
مگر درد ما را دوائے بر آید

قاضی صاحب نے زمینِ خدمت کو چوم کر عرض کیا ۔
" اگرچہ یہ غلام میدانِ حرب و ضرب کا شہسوار نہیں ۔ مگر جان پر کھیل جانا خوب جانتا ہے "۔

سلطان کے پژمردہ چہرے پر مسرت اور شادمانی کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ فرمایا :۔

" قاضی صاحب! میں جانتا ہوں کہ خداوند پاک نے جہاں آپ کو قرآن فہمی اور عدل گستری کی دولت سے مالا مال کیا ہے ۔ وہاں شجاعت و بسالت بھی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ آپ کو اپنے ہمراہ رکھتا ہوں "۔

قاضی صاحب ادائے تشکر کے لئے جھک گئے ۔ کہا
" عالم پناہ کی ذرہ نوازی ہے کہ غلام پر اس قدر شفقت فرماتے ہیں ۔ ناچیز کے ذہن میں اس وقت ایک تجویز آئی

ہے۔ اگر اجازت ہو تو عرض کی جائے۔

"ہاں ہاں ضرور کہو۔ بادشاہ نے متبسم ہو کر کہا۔ اور اُس نے ایسا محسوس کیا۔ گویا بڑا بھاری بوجھ اُس کے سینے سے ہٹایا جا رہا ہے۔

قاضی نے دوبارہ زمینِ خدمت کو چوما اور کہا۔

"دیو رائے اور اس کا ولیعہد رات کو ہمیشہ مجلس عیش گرم کیا کرتے ہیں۔ اگر ظل اللہ اجازت دیں۔ تو یہ غلام اپنے رفقا کی مدد سے ان پر شبخون مارے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کا قتل ہو جانا یقینی ہے۔ اور جس وقت کھتریوں کے لشکر سے شور و غل کی آواز اُٹھے۔ حضور خاطر جمعی سے دولت واقبال کو رکاب میں لے کر دریا کو عبور کر آئیں"!

ہاں! تجویز تو خوب ہے۔ اس سے دشمن کی فوج کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اور اچھی طرح سے پامال کیا جا سکے گا۔ مگر سراج ایسے خیر سگال کو اتنے خطرے میں بھی تو نہیں ڈالا جا سکتا"!

"اس امر کی آپ فکر نہ کریں۔ جس خدائے حیّ و قیوم نے آپ کو اتنا اقبال بخشا ہے۔ وہی آپ کے نمک خوار کی

حفاظت کو کافی ہے۔ یہ کہہ کر قاضی صاحب کھڑے ہو گئے۔ سلطان نے بادلِ ناخواستہ اپنے جان نثار کو گلے سے لگا کر اپنی دعاؤں کے سایہ میں رخصت کیا۔

(۲)

قاضی سراج نے اپنے رفقا کو جمع کر کے اُن میں سے سات یک دل و یک زبان جوان منتخب کئے۔ اور انہیں جوگیانہ لباس پہنا خود زرد رنگ کی ایک چادر آدھی اوپر اور آدھی نیچے پہن کشکول ...... بغل میں ڈال چمٹا ہاتھ میں لے احمد خاں کے خیمہ میں داخل ہُوا۔ اور ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ وہ حیران ہو کر بولا۔

قاضی صاحب! یہ کیا؟

کہا! جب آپ ہمیں مردِ میدان ہی نہیں سمجھتے۔ تو پھر یہاں رہنے سے کیا فائدہ؟ ؎

بنائیں کیا سمجھ کر خاکِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

پھر مسکرا کر سپہ سالار کو آغوش میں لے لیا۔ اور آہستہ سے کان میں کہا۔ آج رات کو راجہ یا اس کا راجکمار ضرور مارا جائے گا۔ اور یہ کام آپ کا یہی حریب ناآشنا قاضی انجام دے گا۔ جس وقت

دشمن کے لشکر سے شور و غل کی آواز بلند ہو۔ چار پانچ ہزار نبرد آزما لے کر دریا عبور کر آپہنچے۔ ہم لڑتے لڑتے گھاٹ تک آپہنچیں گے۔ انشاءاللہ آگے راستہ صاف ہو گا۔"

سپہ سالار نے فرطِ تعجب سے گھور کر قاضی صاحب کو دیکھا۔ اور کہا۔ کیا یہ درست ہے؟

"بالکل!" قاضی صاحب نے متانت سے جواب دیا۔

"شاباش! خدا کی مدد تمہارے شامل حال ہو" احمد خاں نے محبت سے قاضی صاحب کو بغل میں لے لیا۔ اور کہا:۔

"بھائی! واقعی تم بہادر ہو۔ میں نے طنزاً جو الفاظ کہے تھے۔ اُن کی معافی چاہتا ہوں۔ ہاں اتنا کرنا کہ جونہی تمہیں اپنے ارادے میں کامیابی ہو۔ پہاڑ پر آگ جلا دینا شور و غل ممکن ہے سُنائی نہ دے۔ لیکن آگ میلوں تک نظر آسکتی ہے۔"

"بہتر۔ ایسا ہی ہو گا۔"

اتنے میں قاضی صاحب کے ساتھی چرمی ٹوکرے لے کر حاضر ہوئے۔ جو دریا عبور کرنے کی غرض سے خاص طور پر تیار کئے گئے تھے۔ اور قاضی صاحب احمد خاں خانخاناں کو آخری سلام کر کے رخصت ہوئے۔

(۲)

دوپہر کا وقت تھا۔ شدت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ آفتاب عین نصف النہار پر چمک کر انگارے برسا رہا تھا۔ کرشنا کے دونو کناروں پر حضرت آدمؑ کی اولاد تلواروں کو زہر میں بجھائے ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ ہابیل قابیل کے خاکے میں قدرت پھر رنگ بھرنا چاہتی تھی۔ مگر گرمی کی تپش سے سب لوگ اپنے خیموں میں چھپے پڑے تھے۔ دریا کے چڑھاؤ کا یہ عالم تھا۔ کہ دوسرا کنارہ نظر تک نہیں آتا تھا۔ کوہ وقار موجیں اُٹھ اُٹھ کر آسمان کو چوم رہی تھیں۔ کنہری دیدبان اسی ماحول میں پہاڑی پر کھڑا دریا کے پاٹ کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اُسے سطح آب پر چند سیاہ دھبے نظر آئے۔ اُس نے دونو ہاتھوں سے آنکھوں کے گرد ہالہ بنا کر غور سے دیکھا۔ پھر نرسنگھ ہاتھ میں لے کر اتنے زور سے پھونکا۔ کہ سوتے جاگتے سب اچھل پڑے۔ پہرے دار کھانڈے اور کٹار سنبھال گھاٹ پر آ موجود ہوئے۔ سب نے نظریں اُٹھا اُٹھا کر تیرنے والوں کو دیکھنا شروع کیا۔ اگرچہ دریا تیزی سے بہ رہا تھا۔ مگر تیراک کچھ ایسے زبردست تھے۔ کہ تیر کی طرح پانی کو چیرتے اور سطح آب پر لپکے چلے آتے تھے۔ قریب آئے۔

تو رسالدار نے گھور کر دیکھا۔ اور ہنس کر کہا۔ یہ تو کوئی جوگی معلوم ہوتے ہیں۔ مسافر دریا سے نکلے ہی تھے۔ کہ کنعرلوں نے انہیں گھیر لیا۔ اور اپنی زبان میں طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔
درحقیقت یہ مسافر قاضی صاحب اور ان کے رفقا تھے۔ قاضی صاحب تو اچھے خاصے سادھو معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے کنہری زبان میں رسالدار کو نمسکار کیا۔ اس نے درشتی سے کہا۔
تم کون لوگ ہو اور کس غرض سے ہمارے لشکر میں آئے ہو؟
"بابا ہم سادھو لوگ ہیں۔ جگہ جگہ پہنچ کر دیوی دیوتاؤں کے درشن کرتے پھرتے ہیں۔ کاشی سے آرہے ہیں۔ اور وجے نگر میں "شری رنگ" کی یاترا کو جانے کا ارادہ ہے"
"مجھے تو شبہ پڑتا ہے کہ تم جاسوسی کی غرض سے یہاں آئے ہو" رسالدار نے غصہ بار نظروں سے گھور کر کہا۔
رام رام! رام رام!! مہاراج آپ یہ کیا کہتے ہیں۔
فقیروں سے مذاق اچھی بات نہیں۔ ہم دنیا تیاگ چکے۔
اِن مورکھ دھندوں سے منہ موڑ چکے۔ پھر ہم کسی کی جاسوسی کیوں کرنے لگے"
رسالدار اس جواب سے کچھ ٹھنڈا ہُوا۔ اور بولا

"باباجی! جنگ کے شعلوں میں گرنا کہاں کی عقلمندی ہے
کیا وجے نگر کا کوئی اور راستہ نہ تھا۔ ان دنوں آدمی تو بجائے خود
رہا۔ اس کے سائے سے بھی ڈر لگتا ہے۔ اب جب تک یدھ
ختم نہیں ہوتا۔ آپ کو یہاں قید رہنا پڑے گا"
قاضی نے نعرہ لگایا "الکھ نرنجن" ہمیں کون مورکھ روک
سکتا ہے۔ ارے بابا دو دن ہم ملیکھشوں کے ہاں رہے۔ آنے
سے تو انہوں نے بھی نہ روکا۔ بلکہ اُن کے سیناپتی فیروز مہاراج
نے دریا گذارنے کے لئے ٹوکرے دلائے۔ دیورائے کے لشکر
میں آکر ہم قید بھگتیں؟" چلو ہم راجہ کے پاس چلتے ہیں۔ اگر
تمہیں کرشنا میں ڈبکیاں نہ دلاؤں تو رامداس نام نہیں۔
رسالدار ڈر گیا۔ اور کہا باباجی معاف کرو۔ جاؤ جہاں جانا ہو۔
ہم تمہیں نہ روکیں گے۔ قاضی نے لال پیلی آنکھوں سے
رسالدار کو گھور کر دیکھا۔ اور اپنی ٹولی کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے
لشکر کو روانہ ہوئے "بڑا آیا ہے روکنے والا۔ پھر روکا کیوں نہیں۔
جلا کر بھسم نہ کر ڈالتا! پورب پچھم سب ہمیں جانتا ہے"
اب قاضی صاحب نے چمٹے پر بھجن گانا شروع کیا۔
سپن یہ سنسار بھائی رے سپن یہ سنسار

سپن ماتا سپن پتا سپن گورو دوار
سپن گھوڑا سپن ہاتھی سپن اوو تار
سپن راجا سپن پرجا سپن سب بیوپار

قاضی صاحب بمشکل چند ہی قدم چلے تھے۔ کہ آگے دیوراج کا سیناپتی زرہ بکتر لگائے چار آئینہ سجائے سر سے پاؤں تک اوپچی بنا گھوڑے پر سوار نظر آیا۔ ایک رسالہ ساتھ لیئے سینا کو دیکھتا پھرتا تھا۔ قاضی نے پھر زور سے نعرہ لگایا "الکھ نرنجن"

سیناپتی نے گھوڑے پر سے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ اور کہا مہاراج آپ کرشنا پار سے آرہے ہیں کچھ پتہ ہے۔ ملیکھشوں کا سلطان کتنی فوج سے چڑھ کر آیا ہے۔

قاضی نے آنکھیں چار کرتے ہوئے کہا۔

"سیناپتی جی! ہم سادھو لوگ ہیں ان باتوں سے ہمارا کیا واسطہ! اگر ایک دوسرے کی جاسوسی کرنے لگیں۔ تو پھر ہمیں اپنے ملک سے کون گذرنے دے"

سیناپتی کچھ ایسے مرعوب ہوئے۔ کہ پھر بول نہ سکے۔ سادھو اسی طرح چمٹے بجاتے اور بھجن گاتے خیمہ سے صدا کرتے چلے جاتے تھے۔ کہ ایک جگہ سے گانے بجانے کی آواز آئی۔ بڑھ کر دیکھا۔

تو عجب عالم نظر آیا۔ خیمہ میں غالیچہ پر "وجے نگر" کی حسینہ کلا ونتی بصد عشوہ و ناز ستار بجانے میں مصروف تھی۔ اس کی موٹی موٹی سیاہ چمکیلی آنکھیں کمان کی مانند تنی ہوئی بھویں۔ دراز پلکیں گھنگریالے بال، پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ۔ سفید موتیوں ایسے ننھے ننھے دانت عطر بیز کالی زلفیں غضب ڈھا رہی تھیں۔ قاضی کچھ دیر ٹھٹکا مگر پھر کچھ سوچ کر دفعتہً خیمہ میں گھس گیا۔ اور بے تابی سے حسینہ کے پاؤں چومنے لگا۔

کلاونتی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ بولی۔ باباجی! آپ یہ کیا غضب کرتے ہیں"

بولا۔ اے جانِ جہاں! عرصہ گذرا۔ خواب میں تیری دلفریب اور من موہنی شکل دیکھی تھی۔ اس وقت سے یہ حالت ہے۔ کہ نہ رات کو چین ہے نہ دن کو قرار۔ قریہ قریہ تیری تلاش میں پھرتا تھا۔ کہ آج پورے چار سال کے بعد بھگوان نے تیرا درشن کرایا۔ یہ کہہ کر قاضی نے اپنی گودڑی میں ہاتھ ڈالا۔ اور جواہرات و اشرفیوں سے بھری ہوئی دو تھلیاں نکال کر اس کے قدموں پر نچھاور کر دیں۔

پہلے تو کلاونتی ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ جب اس قدر دولت دیکھی تو نرم ہو گئی۔ اس نے اپنے نیم عریاں اور مست شباب

جسم کو لچکاتے ہوئے صراحی میں سے شراب اُلٹی۔ اور قاضی کو چھلکتا ہوا جام پیش کیا۔ کہا "سوم رس ہے پی لیجئے" قاضی نے پیالہ ایک جانب کو رکھ دیا۔ اور کہا میں تو اس امرت کا پیاسا ہوں۔ جو تیری نشہ بار متوالی آنکھوں میں چھلک رہا ہے "سوم رس" کا نشہ عارضی ہے۔ مگر نشیلی نگاہوں کی مستی دائمی اور ابدی ہے۔ یہ کہہ کر بے تکلف حسینہ کے پہلو میں جا بیٹھا۔ کلاونتی کی آنکھیں جواہرات کی جگمگاہٹ سے چندھیا گئی تھیں۔ اس نے قاضی کی تراش خراش سے یہ اندازہ لگا لیا تھا۔ کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس نے اپنی مرمریں باہنیں اس کے گلے میں ڈال دیں اور بولی :-

"سائیں جی! اتنی دولت کہاں اکٹھی کی؟"

"یہ دولت! قاضی کے لبوں پر ایک نفرت انگیز تبسم کھنڈ گیا" سندری! تیرا یہ پوجاری کاشی کے ایک بڑے جوہری کا اکلوتا لڑکا ہے۔ اس نے گولکنڈہ کی کانیں ٹھیکہ پر لے رکھی ہیں۔ وہاں جواہرات گنے نہیں جاتے ہر سال تراشیدہ جواہرات کی ہزاروں بوریاں وساور کو جاتی ہیں۔ جب میں تیری تلاش میں نکلا۔ بوڑھے باپ نے یہ دو تھیلیاں ہمراہ کر دیں۔ کہ شاید سفر میں کام آئیں۔

مگر سادھوؤں کا روپے پیسے سے کیا کام! جب یہ صورت اختیار کی۔ تو پھر ضرورت ہی نہ پڑی۔ ساتوں رفیق سفر ہی میں نصیب ہوئے۔ اور ان کی صحبت میں رات دن بسر کرتا شہر پرنگ کی یاترا کو جاتا تھا۔ کہ راستے میں دُرِ مقصود ہاتھ آ گیا۔

کلاونتی نے پہلی بار محسوس کیا۔ کہ دنیا میں اس کے سچے طلبگار بھی ہیں۔ اس کے نازک نتھنے اوپر نیچے پھڑکنے لگے۔ اس کے دل و دماغ کی تہوں میں کیف و سرور کی موجیں لہرانے لگیں۔ بولی!

"مہاراج کی یہ بڑی دیا ہے کہ اس لونڈی پر اتنا کرم فرمایا یہ آپ کا گھر ہے۔ جب تک رہیں چشم ما روشن دل ما شاد" مگر اس وقت اجازت دیجئے۔ رات کو مجھے یوراج کے دربار میں ناچنا ہے"

قاضی نے لپک کر پکڑ لیا۔ اور کہا "کئی سال کی خاک چھاننے کے بعد بمشکل آج تجھے پایا ہے۔ اب تو میں کسی طرح نہ جانے دوں گا"

حسینہ نے فتنہ در آغوش نگاہوں سے اپنے مجنوں کو دیکھا۔ اور شیریں آواز میں بولی" مہاراج گھبرائیے نہیں میں

جلد لوٹ آؤں گی"

قاضی حسینہ کا دامن مضبوطی سے پکڑ کر گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ اور بولا "اے بتِ جفا کار! اتنی دولت ملنے پر بھی حرص کی آنکھ سیر نہیں ہوئی؟ کہ چاندی کے چند سکّوں کی خاطر اپنے پریمی کو ہجر و فراق میں تڑپتا چھوڑ کر راجہ کے دربار میں جانا چاہتی ہے!"

حسینہ بولی "مہاراج! آپ راجکمار کو نہیں جانتے وہ بڑا پاپی اور ظالم منش ہے۔ اگر میں آج رات اُس کے دربار میں حاضر نہ ہوئی۔ تو کل وہ مجھے مروا کر چیلوں اور کتوں کے آگے پھینکوا دیگا"

"اگر تو جانے کے لئے اس قدر مجبور ہے۔ تو پھر ہمیں بھی ہمراہ لے چل۔ قاضی نے حسینہ کے گورے گورے نازک ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہا"

"مہاراج! یہ اس سے بھی مشکل بات ہے راجہ کے دربار میں صرف وہی جا سکتے ہیں۔ جو گانا بجانا جانتے ہوں۔ مگر آپ تو اس فن سے بے بہرہ ہیں"

"اے پری شمائل اگرچہ میں پہلے اس نعمت سے قطعاً بے بہرہ تھا۔ مگر جب سے تیرا دیدار کیا ہے۔ تیرے عشق نے خود بخود اس

فن سے بہرہ ور کر دیا ہے۔ اگر تو مجھے ہمراہ لے جائے تو نہ صرف گا کر راجہ کو خوش کروں گا۔ بلکہ بعض ایسے کرتب دکھاؤں گا۔ جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔"

حسینہ نے مسکرا کر منڈل پیش کیا۔ اور کہا کہ اگر واقعی آپ کو گانا آتا ہے۔ تو اس سے شوق فرمائیے۔"

قاضی نے منڈل اٹھا کر اس پر اس طرح سے دھرپد خیال ٹپا گایا۔ کہ کبھی اس کے وہم و گمان بھی نہ آیا تھا۔ قاضی نے راگ ختم کیا ہی تھا۔ کہ حسینہ وفور کیف سے بیتاب ہو کر اس سے چمٹ گئی اور اپنے حسن و شباب کی فسوں کاریوں اور دلآویزیوں کا کمند پھینکتے ہوئے بولی:۔

"اے جگت گرو! مجھے یہ گمان تک نہ تھا۔ کہ تم اتنے بڑے راگی ہو۔ اب تم بے تکلف میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ تمہاری وجہ سے کلاونتی کا نام زیادہ چمکے گا۔"

راجکمار وجے نگر نے ایک بڑے خیمہ میں جشن ترتیب دے رکھا تھا۔ ریشمی پردوں پر چاروں طرف سنہری اور روپہلی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ ہر طرف شمعیں اور قندیلیں روشن تھیں اگربتیوں اور عود و عنبر کی خوشبو سے دربار مہک رہا تھا۔ کھتری

سپاہی ننگی تلواریں لئے چاروں طرف پہرے پر استادہ تھے خیمے کے درمیان میں آبنوس کے مرصع اور جواہر نگار تخت پر دیجے نگر کا حسین وجمیل راجکمار بڑی شان وشوکت اور جاہ وجلال سے بیٹھا دادعیش دے رہا تھا۔ دائیں بائیں دُور تک رنگین مزاج مصاحب پر اجمائے شراب سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سب نے سروں پر کامگار دوپٹے اور گلے میں جڑاؤ مالائیں پہن رکھی تھیں۔

تین گھڑی رات گذری تھی۔ کہ دربار میں دنیا بھر کے باکمال مطربوں اور مغنیوں کی حاضری شروع ہوئی۔ میر نشاط جس کا نام لیتا وہ بجلی کی طرح تڑپ کر سٹیج پر رقص میں مصروف ہو جاتا۔ راگی باری باری اپنے رقص کا کمال دکھانے لگے۔ ہر طرف سے واہ واہ کا غل برپا ہو گیا۔ ٹھاکر اور درباری امراء کو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ دفعتہً میر نشاط نے پکارا "کلاونتی!"

ابھی یہ صدا فضا میں لہرا رہی تھی۔ کہ دیجے نگر کی حسین رقاصہ شعلہ جوالہ کی طرح اُچھل کر رقص گاہ میں ناچنے لگی۔ اس کی نشہ میں ڈوبی ہوئی مدبھری آنکھیں۔ متبسم لب۔ نیم عریاں رانیں۔ گداز جسم، متناسب اعضا تماشائیوں کی پیاسی آنکھوں میں کھُبے جا رہے تھے۔ اپنی مرمریں باہوں کو پیچ وخم دے کر گورے

گورے نازک بدن کو لچکا لچکا کر اس نے وہ رنگ جمایا۔ کہ اندر کا دربار بھی ماند پڑ گیا۔ راجکمار سیاہ تخت پر کالے ناگ کی طرح مستی کے عالم میں بیٹھا جھوم رہا تھا۔ اور ٹھاکر تو اس طرح مبہوت ہو رہے تھے۔ گویا رقاصہ کے فنی کمال نے ان کی تمام ذہنی قوتیں سلب کر لی تھیں۔

کلاونتی کے بعد قاضی سٹیج پر نمودار ہوا۔ اُس نے مخصوص انداز میں ستار بجانا شروع کیا۔ ساز میں سوز بھی تھا۔ اور سرور بھی۔ ایک وقت اُس سے ایسی سُریں پیدا ہوتیں۔ کہ دل ڈوبنے لگ جاتا۔ اور ایسا محسوس ہوتا۔ گویا دل پر آرے چلائے جا رہے ہیں۔ پھر تھوڑی سی تبدیلی سے ایسا سماں بندھتا۔ کہ سامعین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ اب قاضی نے کھنکھارا۔ یہ اس امر کی علامت تھی۔ کہ گویا راگی گانا چاہتا ہے سب اہل دربار ہمہ تن گوش ہو بیٹھے۔ قاضی نے بڑے سوز سے گانا شروع کیا۔

۵

رنگا لے چُنریا گندا لے ری سیس
تو کیا کیا کرے گی اری دن کے دن

نہ جانے بُلالے پیا کس گھڑی
کھڑی منہ تکنے گی اری ایک دن

بڑھے بڑے ٹھاکر جو شراب پی پی کر بدہوش ہو رہے تھے۔ وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ اور بے اختیار اُن کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو ٹپک پڑے۔ اس کے بعد قاضی نے مسخروں کا روپ بدلا۔ اور بھانڈوں کی طرح کرتب دکھانے لگا۔ مندل نوازی اور کھیل تماشے سے اہل دربار کو اس طرح محظوظ کیا۔ کہ خیمہ تالیوں سے گونج اُٹھا۔

راجکمار کے ہونٹوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔ اور اس کی موٹی موٹی آنکھیں وفورِ مسّرت سے چمک رہی تھیں۔ خادمائیں اس قدر کھوئی جا چکی تھیں۔ کہ بجائے راجکمار کے اپنے آپ کو پنکھے جھل رہی تھیں۔ قاضی نے جب اہل دربار کو اس طرح بدمست دیکھا۔ تو اس نے ننگی کٹار ہاتھ میں لے کر ناچنا شروع کیا۔ اس کا چیلا بھی کٹار سے مقابلے پر نکل آیا۔ دونوں نے تلواروں سے لڑنا شروع کیا۔ کوئی نصف گھڑی تک یہ لوگ شمشیر زنی کے کمالات دکھاتے رہے۔ پھر ناچتے کودتے راجکمار کے قریب پہنچے۔ اور کچھ دیر رقص کرنے کے بعد یکایک اس چستی اور چابکدستی سے راجکمار پر حملہ کیا۔ کہ کٹاریں

سینہ کو چیرتی ہوئی پار نکل گئیں ۔ اس کا کام تمام کرکے دوسروں کی طرف متوجہ ہوئے ۔ ٹھاکر اور درباری امراء جو شراب کے نشے میں ہوش و خرد کھو چکے تھے ۔ تلواریں نکال لڑنے کو اُٹھے ۔ مگر لڑکھڑا کر گر گئے ۔ پانچ ملنگ جو باہر گوش بر آواز کھڑے تھے شور سنتے ہی پردہ پھاڑ اندر گھس آئے اور سب نے مل کر دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کیا ۔ جب نامی گرامی امراء کا خاتمہ کر چکے تو چراغ اور مشعل بجھا جس سوراخ سے آئے تھے اسی راستہ سے باہر نکل گئے ۔

کنہریوں کا لشکر پندرہ میلوں کی مسافت میں پھیلا پڑا تھا ۔ سب اپنے اپنے خیمے میں بے خبر پڑے سو رہے تھے ۔ جونہی خیمہ شاہی سے غلغلہ بلند ہوا ۔ گھبرا گئے ۔ کسی نے کہا ملیچھوں کا سلطان دس بارہ ہزار سوار سے کرشنا کو عبور کر آیا ہے اور اُس نے راجہ دراجکمار کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا ہے ۔ کوئی کہتا کہ مسلمان لشکر شاہی سے جدا ہو کر کسی دوسرے گھاٹ سے گذر آئے ہیں ۔ اور انہوں نے ہی شبخون مارا ہے ۔ الغرض جتنے منہ اتنی باتیں ۔ رات اتنی اندھیری تھی ۔ کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا ۔ سب اپنی اپنی جگہ پڑے باتیں بناتے رہے مگر کوئی باہر نہ نکلا ۔

(۴)

کوئی آدھی رات کا عمل تھا۔ سلطان فیروز اپنے خیمے میں مصلّے پر بیٹھا خدا کی جناب میں قاضی صاحب اور اُس کے رفیقوں کی فتح و نصرت کے لئے دُعا مانگ رہا تھا۔ کہ اچانک شور سُنائی دیا۔ بادشاہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ہنگامہ بتا رہا تھا۔ کہ جس واقعہ کا انتظار تھا۔ وقوع میں آچکا۔ فوراً موگری اُٹھا کر گھڑیال پر ماری۔ آواز کے ساتھ ہی چوبدار حاضر ہُوا۔

"سپہ سالار کو حاضر کرو" سلطان نے للکار کر کہا

تھوڑی دیر بعد احمد خاں خیمے میں داخل ہُوا۔ بادشاہ دریا کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ آہٹ پا کر بولا " احمد خان! سگنل ہو گیا۔ وہ دیکھو۔ پہاڑ پر آگ جل رہی ہے "

"جی ہاں۔ قاضی صاحب مقصد میں کامیاب ہو گئے "

تو پھر دیر مت کرو۔ پانچ ہزار چابکدست جان باز ہمراہ لے فی الفور دریا میں کود پڑو۔ ما بدولت بہت جلد پہنچنے کی کوشش کریں گے "

"بہتر عالم پناہ" یہ کہہ کر احمد خاں باہر نکلا۔ فوج پہلے سے تیار کھڑی تھی۔ چار ہزار گھوڑے زیر بند کاٹ کر دریا میں چھوڑ دئے

اور اسی قدر جنگ آزما مجاہد چرمی ٹوکروں میں بیٹھ دریا کو عبور کرنے لگے۔

کرشنا کالے پہاڑوں میں چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ اور اُس کی مہیب طوفانی موجیں پہاڑوں سے ٹکرا ٹکرا کر شور محشر بپا کر رہی تھیں معلوم ایسا ہوتا تھا۔ کہ دیو لڑ رہے ہیں۔ دو گھنٹے کی جرأت آزما کشمکش کے بعد غازیانِ اسلام کنارے پر جا پہنچے۔ ابھی رات کا پچھلا پہر رہتا تھا۔ مشرق سے چاند روپہلی رتھ پر سوار ہو کر دنیا کو منوّر کرنے کے لئے برآمد ہوا۔ پہرے دار جو ساحل دریا پر ہوشیاری اور حفاظت کے لئے مامور تھے۔ بادشاہی لشکر سے خائف ہو کر بھاگ گئے۔ فیروزمند لشکر نے کنہریوں کو نوکِ سنان پر دھر لیا۔ دیو رائے کو جب اپنے راجکمار کے قتل ہونے کا علم ہوا۔ تو جہان اس کی نگاہوں کے سامنے تیرہ و تار ہو گیا۔ روتا پیٹتا اپنے بیٹے کے ویران دیوان خانے میں آیا۔ مشعل کی روشنی میں اپنے فرزند جگر بند کی لاش پہچان کر دھاروں دھار رو دیا۔ ملازموں نے حاضر ہو کر عرض کی۔ کہ سلطان کا لشکر ادھر کو آرہا ہے۔ دیو رائے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بے تحاشا لاش اٹھا وجے نگر کو بھاگ نکلا۔ ابھی نیّرِ اعظم کا طلوع نہیں ہوا تھا۔ کہ خورشید کلاہ، اقبال مند سلطان نے کرشنا کے مہیب دریا کو عبور

کرکے ساحل پر قدم رکھا۔ قاضی صاحب بہروپیوں کے لباس میں حاضر ہوئے۔ اور کہا کہ سلطان کا اقبال بلند، دشمن بری طرح بدحواس ہوکر بھاگم بھاگ دیجے نگر کو جارہا ہے۔ اس کا سارا لشکر پندرہ میل تک بے ترتیبی سے پڑا ہے۔ اگر پوری طاقت سے حملہ کیا جائے تو فتح یقینی ہے۔

قدردان بادشاہ نے فرط محبت سے قاضی صاحب کو گلے سے لگا لیا۔ اور فرمایا "زود ببینی کہ ترا نہال خواہم کرد" پھر کرنا ہاتھ میں لے زور سے پھونکی اور للکار کر کہا۔

"مردان بکوشید تا جامۂ زنان نپوشید"

ادھر سورج کا خون میں نہایا ہوا رتھ مشرق کے سر بفلک

سلے ہمارے علماء اور مشائخ کو اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے۔ کہ ان کا کام حجرے میں تسبیح و تہلیل پر ہی ختم نہیں ہوجاتا۔ بلکہ اگر ضرورت پڑے تو انہیں عبا و قبا اور عمامہ و جریب پھینک ایمانی تلوار ہاتھ میں لے میدانِ کارزار میں دادِ شجاعت بھی دینی چاہیے۔ زمانے کا مؤرخ "سراج الحق" کی جان بازی کو اس طرح سراہتا ہے۔ سہ

جوانمرد قاضی چوں غرندہ شیر سوئے راۓ زادہ درآمد دلیر
دراکشت دبر دیگراں حملہ کرد دمار از ہنوداں بر آورد گرد

سیاہ پہاڑوں سے نمودار ہوا - اُدھر جنگ کا سُرخ پھریرا ہوا میں لہرایا - نقارے پر چوٹ پڑی - اور گلبرگہ کا سلطان سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق، مشکی گھوڑے پر سوار، چتر لگائے اصفہانی تلوار علم کئے بڑے جوش کے ساتھ دشمنوں پر حملہ آور ہوا - وجے نگر کا سیناپتی مقابلے میں جم نہ سکا - اور شکست کا داغ ماتھے پر لگا اس طرح بھاگا - کہ راجدھانی میں جا کر دم لیا - لشکر سلطانی نے بیجانگر کے اطراف تک تعاقب کیا - اور لاکھوں کو تلوار کے گھاٹ اُتارا - دشمن بدحواسی میں اس قدر سامان چھوڑ گیا تھا - کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا - خیمے - ڈیرے - شامیانے - سراپردے - دیبائے رومی - اطلس فرنگی - فرش و فروش کے علاوہ سپاہیوں نے زخمیوں کی کمروں اور مردوں کی ہمیانیوں سے جو طلائی اور نقرئی مہریں نکالیں - اُن کا تو کچھ حساب ہی نہ تھا -

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہُدا کا کہ ہے ساری مخلوق کنبا خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

میواڑ کی رانی

"ہندوستان کے شہنشاہ کو چتوڑ کی ایک مظلوم عورت کا سلام پہنچے۔ گجرات کے بادشاہ نے عاجز اور بے وارث سمجھ کر پوری طاقت سے اس پر حملہ کر دیا ہے۔ اس وقت کرنا رتھ، اس کے کمسن بچے اور چتوڑ کے ہزاروں لاکھوں افراد کی عزت اور زندگی خطرے میں ہے۔ انتہائی مصیبت میں یہ دکھیارا کھی بھیج کر آپ سے خواہرانہ درخواست کرتی ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو اپنی مظلوم بہن کی امداد کو پہنچیے۔"

کرنا رتھ

کچھ عرصہ گذرا۔ جب ہندوستان مغربی تکلفات اور دو رنگی سے
نا آشنا تھا۔ ہر طرف پریم اور شانت کا دَور دَورہ تھا۔ چھوٹے بڑوں
کا ادب کرتے تھے۔ اور بڑوں کے دلوں میں عزیزوں کے لئے محبت
اور شفقت کا دریا موجیں لیا کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں بزرگوں نے بھائیوں
اور بہنوں کے درمیان محبت اور الفت بڑھانے کے لئے راکھی کی ایک
رسم جاری کر رکھی تھی۔ ہر سال ساون کے مہینہ میں جب موسلادھار
بارشوں اور موسمی میووں کی کثرت سے ہندوستان جنت نشان
بنا ہوتا۔ ہندوستانی دیویاں اپنی حیثیت کے مطابق ریشم یا سوت
کی سرخ رنگ کی ڈوری لے کر اُسے نہایت خوبصورتی سے گوندھ
لیتی تھیں۔ امیر زادیاں سنہری روپہلی تاروں سے اس میں طرح
طرح کے موتی بھی پرو لیتی تھیں۔ اس موقع پر بہن اپنے بھائی
کے ہاں جاتی اور اس کے دائیں ہاتھ کی کلائی پر اس راکھی کو باندھ
دیتی تھی۔ اس پر بھائی خوشی سے باغ باغ ہو جاتا۔ اور بہن کو

قیمتی لباس اور نقد روپے ادا کرتا - اگر یہ راکھی کسی غیر شخص کے ہاتھ پر باندھ دی جاتی - تو وہ بھی اس دیوی کا "راکھی بند بھائی" بن جاتا تھا -

---

۱۵۳۵ء میں عروس البلاد چتوڑ پر سلطان بہادر شاہ والئے گجرات چڑھ آیا - رانا سانگا کی شیر دل رانی کرنا وتی نے قلعہ بند ہو کر خوب مدافعت کی - اور چتوڑ کے راجپوتوں نے بھی اس بہادری سے مقابلہ کیا - کہ سلطان دو ماہ کے طویل عرصہ میں چتوڑ کی ایک اینٹ بھی قبضہ میں نہ لاسکا - اسی لیل و نہار میں ساون کا مہینہ آگیا - اور اس تقریب پر راجپوت دیویاں اپنے بہادر بھائیوں کے ہاتھوں پر راکھی باندھنے لگیں - مگر معمول کے مطابق خوشنما پوشاک اور نقدی کے لئے نہیں بلکہ اپنی عزتوں کی حفاظت کے لئے - راجپوت جوانوں نے بڑے بڑے قول و اقرار کئے - اور مصیبت کے اس عالم میں بھی حیثیت سے بڑھ کر بہنوں کو پوشاکیں اور نقد روپے ادا کئے - ادھر مہارانی نے بھی بڑے ارمانوں کے ساتھ راکھی تیار کی - ریشم کی ڈوری پر سنہری روپہلی تاروں کے ساتھ قیمتی موتی پرو دئے - اور حد درجہ کی خوبصورتی سے اُسے گوندھ

مگر متامل تھی کہ اس پریشانی کے وقت کسے پہنائے - جو اس کی امداد کر سکے - پہروں فکر مند رہی - آخر کسی خیال کے آنے سے دفعتہً اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں - فوراً اپنے ہاتھ سے ایک خط لکھا - اور راکھی اس میں بند کر کے اپنے ایک معتمد سردار کو طلب کیا - اور یہ چٹھی اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا " یہ ایک پیغام ہے - جو میں نے شہنشاہ ہند کے نام لکھا ہے - پر لگا کر پہنچو - اور جہاں لشکر شاہی خیمہ انداز ہو - یہ خط شہنشاہ کے ملاحظہ سے گذار دو " راجپوت جوان نے سر جھکا کر مہارانی کو پرنام کیا - اور خط لے کر بادرفتار گھوڑے پر سوار ہو ، ہوا ہو گیا -

---

شہنشاہ ہند نصیر الدین ہمایوں ان دنوں شیر خاں کی بغاوت فرو کرنے کے لئے بنگال میں مقیم تھا - ایک دن عصر کی نماز سے فارغ ہو کر ایوانِ خاص میں اپنے اُمرائے خصوصی سے جنگی معاملات پر گفتگو کر رہا تھا - کہ چوبدار اندر داخل ہُوا - اور عرض کی حضور چتوڑ کی مہارانی کا قاصد آیا ہے - رات دن کے سفر نے اُسے نڈھال کر دیا ہے اور اس کا گھوڑا تھکاوٹ کے مارے ہا ہر دم توڑ رہا ہے -

شہنشاہ نے فکرمند ہو کر کہا " اسے حاضر کرو "
تھوڑی دیر کے بعد ایک بانکا ترچھا راجپوت جس کا چہرہ خزاں کے پتوں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ بارگاہِ سلطانی میں حاضر ہوا۔ اور آداب شاہی بجالانے کے بعد مہارانی کا خط اور راکھی پیش کی۔

شہنشاہ فرطِ حیرت سے چلّا اٹھا —— راکھی! —— اور مہارانی کرناوتی کی!! میں اسے فخر سے اپنی کلائی پر باندھوں گا اے محترم قاصد آگے بڑھ! اور اپنے ہاتھ سے اس رسم کو ادا کر!!
خوشی سے قاصد کے آنسو نکل پڑے۔ اس نے بڑے اشتیاق سے شہنشاہ کے دائیں ہاتھ کی کلائی پر راکھی باندھی۔ دربار محوِ حیرت ہو رہا تھا۔ اور خدا کی رحمتیں اس وقت تیمور کے بیٹے پر نثار ہو رہی تھیں۔

" ہاں! —— اب خط پڑھو۔ بہن بھائی سے کیا مانگتی ہے؟" شہنشاہ نے متبسم ہو کر کہا۔
وزیر اعظم بیرم خاں نے خط پڑھنا شروع کیا۔ ہندوستان کے شہنشاہ کو چتوڑ کی ایک مظلوم عورت کا سلام پہنچے۔ گجرات کے بادشاہ نے عاجز اور بے وارث سمجھ کر پوری طاقت سے اس

پر حملہ کر دیا ہے۔ اس وقت کرنارتھ، اس کے کمسن بچے اور چتوڑ
کے ہزاروں لاکھوں افراد کی عزت اور زندگی خطرے میں ہے۔
انتہائی مصیبت میں یہ دکھیا راکھی بھیج کر آپ سے خواہرانہ درخواست
کرتی ہے۔ کہ جتنا جلد ممکن ہو۔ اپنی مظلوم بہن کی امداد کو
پہنچیے......"

بیرم خاں یہاں تک پڑھنے پایا تھا۔ کہ شہنشاہ نے گلو گیر ہو کر
کہا۔ بس۔ زیادہ سننے کی تاب نہیں رہی۔ لشکر میں اعلان کر دیجئے
کہ کل علی الصباح لشکر ہمایونی کا رخ چتوڑ کو ہو گا۔ کمزور اور بیمار
سپاہیوں کو الگ کر دیا جائے۔ تاکہ لشکر کی روانگی میں تاخیر نہ ہو۔
دہلی کا شہنشاہ اپنی بہن کی امداد کو جلد از جلد چتوڑ پہنچنا چاہتا ہے۔"
بیرم خاں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "عالم پناہ کا ارشاد بالکل
بجا ہے۔ مگر دشمن لومڑی سے زیادہ چالاک اور شیر سے زیادہ قوی
ہے۔ اگر محاذ جنگ سے کوکبۂ سلطانی نے اتنی سرعت سے کوچ
کیا۔ تو شیر خاں موقع پا کر دار السلطنت پر قبضہ کر لے گا۔"
"کچھ پرواہ نہیں ——— ایک مظلوم امداد مانگے۔ اور
ہمایوں مصلحت دیکھے یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"
اسی وقت اپنے دست خاص سے شہنشاہ نے مہارانی

کو خط لکھا۔ کہ "ـــــ ہمایوں اپنی بہن کی امداد کے لئے کل صبح کو ہی یہاں سے چل پڑے گا۔ اطمینان سے قلعہ بند ہو کر دشمن کے حملوں کا جواب دیا جائے"

مہر شاہی ثبت کر کے خط قاصد کے حوالے کیا۔ اور خود سفر کی تیاری کے لئے محلسرا میں چلا گیا۔

مہارانی ہمایوں کے انتظار میں بڑی مستقل مزاجی سے دشمن کا مقابلہ کر رہی تھی۔ کہ ایک رات اچانک بوکا پہاڑی سے دھماکے کی آواز آئی۔ جس سے ۴۵ ہاتھ فصیل آڑ گئی۔ اور ایک برج بھی ٹوٹ کر نیچے آ رہا۔ چتوڑ میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مہارانی خود مسلح ہو کر باہر نکل آئی۔ اور رخنے کے مقام پر توپیں رکھوا کر فوج کے ایک دستہ کو اُن کے پیچھے متعین کیا۔ اور انہیں مخاطب کر کے کہا۔

"چتوڑ کے بہادرو! دشمن تمہارے قلعہ کو توڑ چکا ہے۔ اب جانبازی کا وقت ہے۔ اگر تم نے اپنے فرض کو اچھی طرح سے انجام نہ دیا۔ تو تمہارے مقدس شہر کی اینٹ سے اینٹ بج جائیگی۔ تمہارے بچے لاوارث ہو جائیں گے۔ اور دشمن تمہاری بہو بیٹیوں

کی بے عزتی کریں گے۔ اگر تم کتوں کی موت مرنا نہیں چاہتے۔ اگر تم اپنی عورتوں کی عصمت کے پامال ہونے کا منظر دیکھنا نہیں چاہتے تو آگے بڑھو۔ اور دشمن کو دکھا دو کہ چتوڑ کا بچہ بچہ سنگرام اور رتن سنگھ ہے!"

اس تقریر سے راجپوتوں میں ایک ناقابل بیان جوش پیدا ہو گیا۔ اور ان کی شریانوں میں مردانگی کا خون کھولنے لگا۔ انہوں نے دشمنوں پر اس قدر تیر برسائے۔ کہ وہ انتہائی کوشش کے باوجود فصیل پر نہ چڑھ سکے۔ پچھلے پہر بہادر شاہ خود اپنی خاص فوج کے ساتھ آگے بڑھا۔ مہارانی گھوڑے پر سوار ہو کر بجلی کی طرح موقعہ پر پہنچی اور سلطان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اے گجرات کے بہادر جرنیل! کیا تم سنگرام کے کمسن بچے سے مظفر کی ناکامی کا بدلہ لینے آئے ہو۔ یا ہمارے اس احسان کا معاوضہ دینے آئے ہو۔ جو ہم نے محمود خلجی کو زخمی پا کر تیمارداری کی صورت میں کیا تھا! ایک کمزور عورت سے لڑنا کہاں کی مردانگی ہے۔ اگر شجاعت کے جوہر دکھلانے ہیں۔ تو کسی بڑے بادشاہ سے لڑو۔ مجھ غریب بیوہ سے لڑ کر کیا لو گے؟"

یہ کہہ کر شمشیر علم کر کے دشمنوں پر ٹوٹ پڑی۔ رانی جواہر بائی

سنے جب مہارانی کو نرغے میں پھنسا دیکھا۔ فوراً ہتھیار لگا، گھوڑے پر سوار ہو، مہارانی کے عقب میں جا پہنچی۔ اور جوش فدویت میں تلوار چلاتی، دشمنوں کو گراتی بڑھتی چلی گئی۔ اس نے مہارانی کو توخطرے سے بچا لیا۔ مگر خود اس پر ایک گجراتی سپاہی نے ایک تیر ایسا کھینچ مارا۔ کہ اس بہادر خاتون کے سینہ میں ترازو ہو کر رہ گیا۔ اور شجاعت و تہور کی دہ دیوی "آہ" کہہ کر نیچے گر پڑی۔ مہارانی بیتاب ہو کر پلٹی۔ اور سرعت سے اس شہیدِ وطن کے نیم جان لاشہ کو ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ جواہر بائی نے نیم وا آنکھوں سے مہارانی کو دیکھا۔ کہا "شکر ہے کہ حق ادا ہو گیا" پھر مسکرا کر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

مہارانی کرنا رتھ جواہر بائی کے کریا کرم سے فارغ نہ ہونے پائی تھی۔ کہ غربی جانب سے ایک اور برج کے گرنے کی آواز آئی۔ توپ خانے کا ترکی افسر نہایت سرگرمی سے فصیل اڑانے میں مصروف تھا۔ مہارانی نے بوندی کے راجہ صاحب کو ایک بڑی جمعیت کے ساتھ اس طرف روانہ کیا۔ اور خود شاہ برج پر چڑھ کر ہمایوں کا رستہ دیکھنے لگی۔ مگر نگاہیں تھک کر گر پڑیں۔ اور

اُمید کا وہ ستارا جو افق پر سے چمک چمک کر چتوڑ باسیوں کو فتح و نصرت کا پیام دے رہا تھا۔ گجراتی گھٹا میں چھپ گیا۔ مہارانی کے قدم یاس و قنوط سے سَو سَو من کے ہو گئے۔ ایک آہ جگر دوز کھینچ کر کہا۔ افسوس! دہلی کے شہنشاہ کو دیر ہو گئی۔ اب زیادہ انتظار فضول ہے۔"

مہارانی خادمہ کے سہارے نیچے اُتری۔ یہاں قاصد شہنشاہ ہند کا جواب لئے کھڑا تھا۔ مہارانی نے خط پڑھا۔ مگر اب اُسے مایوسی ہو چکی تھی۔ قاصد کے بیان کے بموجب شہنشاہ کے آنے میں ہفتہ بھر کی دیر تھی۔ مگر یہاں ایک دن کی بھی امید نہ تھی۔ فصیل چھلنی ہو چکی تھی۔ بُرج منہدم ہو چکے تھے۔ اہل لشکر خستہ و خوار اور زخموں سے نڈھال ہو رہے تھے۔ اس لئے کنور باگ جی کو طلب کر کے اُسے راجہ دیول بنایا اور خود جوہر کی رسم ادا کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔

پہلے قیمتی مال و اسباب کر جلا دیا گیا۔ تاکہ دشمن کے ہاتھ نہ لگے پھر شہر کے بڑے مندر میں پوجا کے لئے گئی۔ چتوڑ میں جیوہار کے لئے راجہ دیول کی طرف سے اعلان ہو چکا تھا۔ کم و بیش تیرہ ہزار ـــــ عورتیں اور لڑکیاں حفظِ ناموس کے لئے جل مرنے کو آمادہ ہو گئیں۔ شہر کا شہر مندر کو اُلٹ پڑا۔ دیر تک گھنٹے بجتے رہے۔ کبھی کبھی پجاری

ناقوس بھی بجا لیتے تھے۔ اس کے بعد یہ تمام عورتیں اس تہ خانے میں داخل ہو گئیں۔ جس کے نیچے بارود بچھ رہا تھا۔ مہارانی ایک بار پھر شاہِ برج پر چڑھی۔ کہ شاید شہنشاہ دہلی کا لشکر آ رہا ہو مگر وائے ناکامی ع

تھک تھک کے گر پڑی نگہِ انتظار آج

مایوس ہو کر واپس آئی۔ شہر کے جملہ اکابر و امراء مہارانی کے آخری درشنوں کے لئے صفیں باندھے کھڑے تھے۔ مہارانی سب کو محبت سے پرنام کرتی ہوئی تہ خانے کے دروازے تک پہنچ گئی۔ یہاں اپنے کمسن بچے رانا اودے سنگھ کو کلیجہ سے لگا کر آخری پیار کیا۔ پھر اُسے راجہ صاحب بوندی کے حوالے کر کے کہا "یہ میری نشانی خدا اور آپ کے سپرد ہے اگر اس پر کچھ آنچ آئی۔ تو سنگرام کا نام و نشان دنیا سے مٹ جائے گا"۔ اس کے بعد فوراً دروازہ بند ہو گیا راجہ دیوک نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے بارود کو آگ دکھائی۔ ایک ہولناک دھماکے کی آواز آئی۔ جس سے تہ خانے میں آگ لگ گئی شعلے اُٹھ اُٹھ کر آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اور آن کی آن میں چتوڑ کی تیرہ ہزار عصمت مآب دیویاں جل کر راکھ ہو گئیں۔

اب راجپوتوں نے دروازے کھلوا دئے۔ اور زعفرانی لباس پہن کر شیرِ غراں کی طرح دشمن پر حملہ آور ہُوا۔ جدھر رُخ کرتا صفوں کی صفیں اُلٹ کر رکھ دیتا۔ آخر بڑی جانبازی کے بعد یہ بہادر سپہ سالار بھی دادِ شجاعت دیتا ہُوا مارا گیا۔ اور ساتھ ہی اس کی فداکار نور [illegible] بھی مردانگی کے جوہر دکھا کر ٹھنڈی ہو گئی۔

سلطان بہادر شاہ فتح و نصرت کے شادیانے بجواتا اندر داخل ہُوا۔ مگر یہاں کیا دھرا تھا۔ ہر طرف بہادر راجپوتوں کی خون میں نہائی ہوئی لاشیں زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔ کہ دوسروں کی غلامی سے موت اچھی ہے۔ یا چند ٹوٹے پھوٹے محلات تھے۔ جو حیرت سے منہ کھولے ظفریاب لشکر کو درسِ عبرت دے رہے تھے۔

چتوڑ میں تو اتنا کچھ ہو گیا۔ اُدھر ہمایوں گھٹا کی طرح دریاؤں اور پہاڑوں پر سے اُڑا چلا آتا تھا۔ مگر جب چتوڑ کے قریب پہنچا۔ تو اسے معلوم ہُوا۔ کہ معاملہ ختم ہو چکا۔ اور راکھی بند بہن اس کا انتظار کرتے کرتے سورگ جا پہنچی۔ آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اور کہا " افسوس تیمور کا پوتا اپنی

ہندوہن سے سرخرو نہ ہو سکا۔" پھر کہا ——— اچھا میں اس دھبتے کو بہادر شاہ کے خون سے دھوؤں گا" یہ کہہ کر بہادر شاہی فوج کا محاصرہ کرلیا۔ مگر وہ تاب نہ لا کر بھاگ گیا۔ شہنشاہ نے چمپانیر۔ کمبوجا اور دیوپور تک اس کا تعاقب کیا۔ وہاں سے بہادر شاہ ایسا روپوش ہوا۔ کہ پھر اس کا نشان تک نہ ملا۔

ہمایوں چتوڑ واپس آیا۔ اودے سنگھ کو طلب کر کے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ اور بکرا جیت کو گدی نشین کر کے دہلی کو لوٹ گیا۔ کہتے ہیں کہ ہمایوں زندگی بھر رانی کرنا وتی کے جل جانے پر افسوس کرتا رہا۔
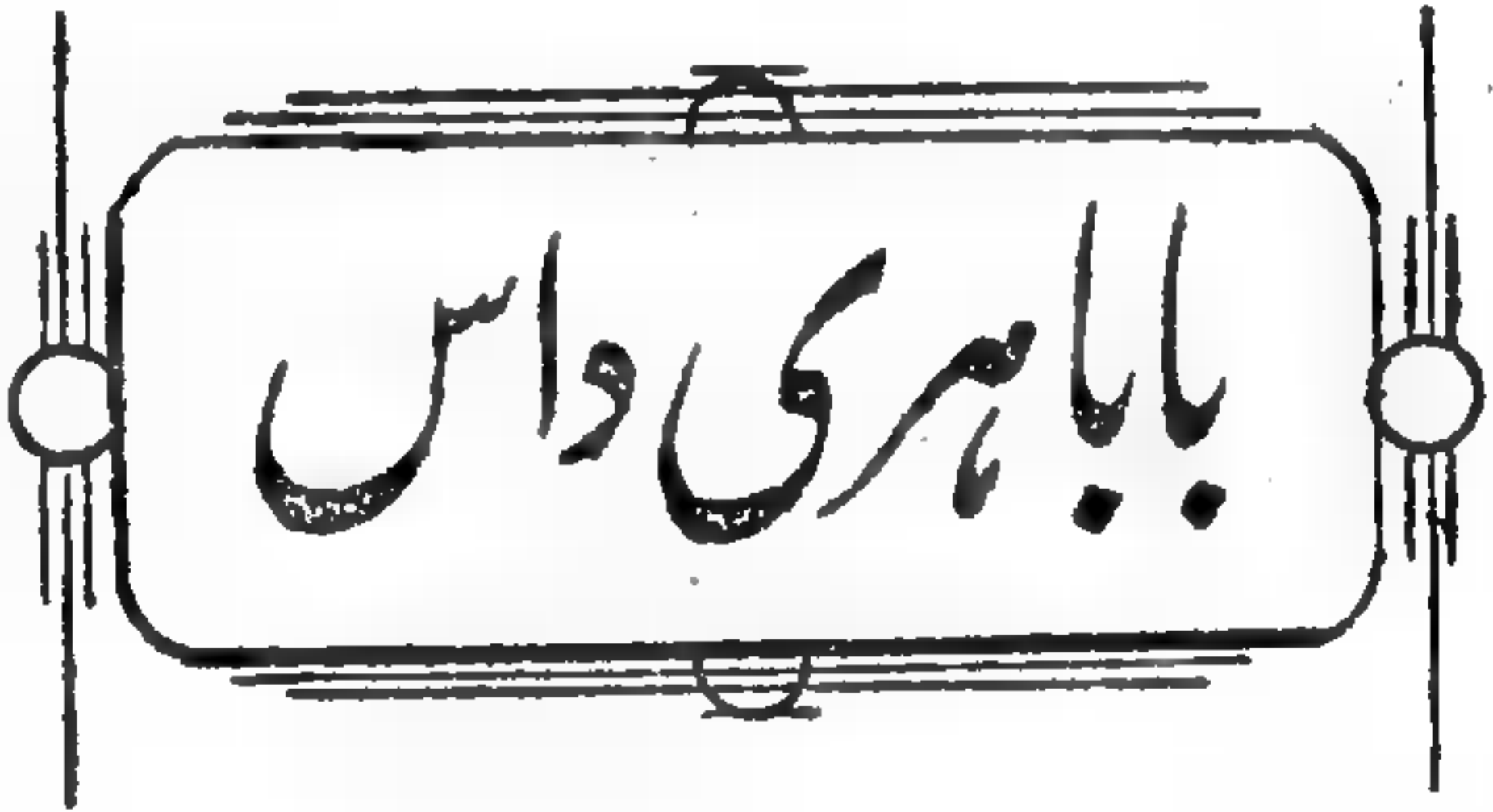
بابا ہری داس

"مہاراج! یہ ستار بردار میرا ملازم نہیں بلکہ میرا آقا اور مملکت ہند کا ان داتا اکبر شاہ ہے جس نے محض مہاراج کے درشنوں کی خاطر یہ روپ دھارن کیا ہے"

"تان سین"

(۱)

"تان سین!"

"مہابلی"

"آج ہم بہت تھکے ہوئے ہیں۔ کوئی ایسا نغمہ سناؤ۔ جس سے ہماری ساری کلفتیں دُور ہو جائیں!"

"بہتر عالم پناہ"

اکبری عہد کے "بلبل ہزار داستان" میاں تان سین نے یہ کہہ کر ستار اُٹھا اس پر "شیام کلیان" گانا شروع کیا۔ مغل اعظم کو یہ نغمہ بہت پسند تھا۔ جونہی اس کی خوش آیند آواز سماعت علیا میں پہنچی۔ اپنے مخمل کے بستر پر دراز ہو گیا اور بڑے ذوق شوق سے سننے لگا۔ دنیائے موسیقی کا شہر یار تان سین بڑے جوش و خروش سے گاتا بجاتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے رُوح پرور تاثرات نے تھوڑی

دیر کے لئے دونو کو دنیا و ما فیہا سے بے خبر کر دیا۔ تان سین کی انگلیاں نہایت سرعت سے ستار پر اپنا کام کر رہی تھیں۔ لحن داؤدی برابر سحر انگیزی میں مصروف تھا۔ اور مغل اعظم الگ متکیف و بے خود نظر آتا تھا۔

راگ ختم ہو گیا۔ اکبر نے نیم وا آنکھوں سے تان سین کو دیکھا۔ اور کہا۔

" نغمہ بھی ایک جادو ہے۔ میاں تان سین! آج ہم بہت خوش ہوئے "

تان سین ادائے شکر کے لئے زمین بوس ہُوا مغل اعظم نے سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔

میرے بلبل! جب ہمارا قلب و دماغ سلطنت کے تفکرات سے پریشان ہو جاتا ہے۔ جب ہم دربار سے تھک ہار کر یہاں آ پڑتے ہیں۔ تو تمہاری نغمہ سنجیاں ہمیں معاملات شاہی کی تکمیل کے لئے دوبارہ تازہ دم کر دیتی ہیں"

" یہ حضور کی ذرّہ نوازی ہے کہ غلام کے حق میں اس قدر شفقت فرماتے ہیں ورنہ ہندوستان کے شہنشاہ کو نائیکوں اور مطربوں کی کیا کمی ہے "

"ہاں! ٹھیک کہتے ہو۔ مطرب ہزاروں مل سکتے ہیں۔ مگر اس فن لطیف کا جگت گرد تان سین اور نہیں مل سکتا۔"

"لیکن بابا ہری داس وہ کامل الفن مطرب ہے۔ کہ تان سین بھی اس کی شاگردی پر ناز کرتا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تان سین! کیا بابا ہری داس تم سے اچھا گا بجا سکتا ہے؟"

"ہاں مہابلی! وہ دنیائے موسیقی کے بادشاہ ہیں۔ ان کی سحر انگیز لے فرشتوں کو بھی مسحور کر دیتی ہے۔"

"یہ بات ہے ——؟"

"ہاں عالم پناہ"

"ہم اسے دربار میں طلب کر کے اس کا گانا سنیں گے۔ اگر واقعی وہ کامل الفن نکلا۔ تو ہم اسے انعام و اکرام سے مالامال کر دیں گے۔"

"مگر جہاں پناہ! سوامی جی ایک سادھو ہیں۔ فقیر لوگ دربار میں آنا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے طلب کر کے انہیں روحانی اذیت نہ پہنچائیے"

"اگر وہ نہ آئے گا۔ تو اکبر خود جا کر اس کا گانا سُنے گا"

"اگر آپ تشریف لے گئے۔ تو وہ بھی ہرگز نہ گائیں گے"

اس جواب نے شہنشاہ کے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ بے ساختہ پکار اُٹھا۔

"تان سین! میں کسی نہ کسی صورت اس باکمال انسان سے ضرور ملوں گا"

تان سین نے کچھ دیر فکرمند رہنے کے بعد عرض کیا۔ کہ "اگر جہاں پناہ کو سوامی جی سے ملنے کا اس قدر اشتیاق ہے۔ تو خفیہ طور سے اپنے اس خادم کے ہمراہ تشریف لے چلیں"

"ہاں! ہم ایسا ہی کریں گے"

(۲)

بالک ہٹ، تریا ہٹ اور راج ہٹ مشہور ہے۔ جب بھی بچوں۔ عورتوں اور بادشاہوں کو کوئی خیال آجاتا ہے۔ فوراً کر گذرتے ہیں۔ خاص کر اولوالعزم سلاطین کو ایک دفعہ جو خیال آجائے۔ پھر جب تک اُسے عملی جامہ نہ

پہنالیں چین سے دم نہیں لیتے۔ چنانچہ ایک دن یہ باتیں ہوئیں۔ دوسرے دن سلطنت کے کاروبار ابوالفضل کو سمجھا بجھا کر شہنشاہ اکبر ملازم کے بھیس میں تان سین کے ہمراہ متھرا کو چل دیا۔

متھرا پہنچ کر تان سین اپنے نقلی ملازم کے ہمراہ ایک سرائے میں اترا۔ جوں توں کر کے بڑی مشکل سے رات بسر کی۔ صبح سویرے اکبر اعظم سے اپنی ستار اٹھوا کر جمنا کو روانہ ہوا۔ یہاں ایک گپھا میں باواجی گیان دھیان میں مصروف تھے۔ کچھ دیر انہیں انتظار کرنا پڑا۔ جونہی فارغ ہوئے اور تان سین پر نگاہ پڑی۔ خوشی سے باغ باغ ہوگئے۔ بے تحاشا اُٹھے۔ اور اپنے پیارے چیلے کو کلیجے سے چمٹا لیا۔ پھر پیار سے اپنے پاس بٹھا کر کہا

"کہو بیٹا! کیسی گذر رہی ہے؟"

"آپ کی دیا سے بہت اچھی گذر رہی ہے"

"ہاں بیٹا! تمہاری شہرت کی داستانیں سُن سُن کر میں اسی گوشے میں بیٹھا نہال ہو رہا ہوں۔ میں نے سُنا ہے۔ کہ اکبر شاہ تم سے پریم کرتا ہے۔ اور دربار کے سورما تم پر جان

دیتے ہیں"

"ہاں مہاراج! شہنشاہ کی قدر دانی کا کیا کہنا۔ وہ بڑے دیالو ہیں سوامی جی"

"بیٹا! بادشاہوں کے دربار میں رہنا بڑا کٹھن کام ہے۔ دیکھنا کہیں تمہاری زبان سے پرماتما کے بے قصور بندوں کو نقصان نہ پہنچے۔ جتنا ممکن ہو۔ ہر ایک سے بھلائی کرنا۔ کیونکہ بھلائی کرنا ہی سچا دھرم ہے"

"ایسا ہی ہوگا مہاراج"

"بیٹا! ذرا اس وقت کو یاد کرو۔ جب تم گوالیار کے باغ میں شیر۔ بھالو اور بندر وغیرہ کی بولیاں بول کر پرندوں اور آدمیوں کو ڈرایا کرتے تھے۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ ایک زمانہ میں تم اکبر کے دربار میں جا کر چمکو گے

اب جو بھگوان نے تم پر اتنی دیا کی ہے۔ تمہارا بھی فرض ہے کہ اس کی مخلوق پر دیا کرو"

سوامی جی اتنا کہنے پائے تھے۔ کہ اچانک اکبر پر نظر جا پڑی پوچھا "یہ کون ہے بیٹا"

" میرا ساتھی ہے مہاراج استاد کے ہمراہ آیا ہے ۔"

" اس کا چہرہ روشن اور اس کی آنکھیں بڑی چمکیلی ہیں ۔ اسے نہ چھوڑنا ۔

"تان سین! اس کی پیشانی سے خوش بختی کے آثار ظاہر ہیں ۔"

اکبر نے سہم کر آنکھیں جھکا لیں ۔ کہ کہیں پردہ فاش نہ ہو جائے ۔

"تان سین نے بھی ملازم کے حق میں چند تعریفی کلمات کہہ ڈالے ۔ پھر فوراً کہا ۔

مہاراج! عرصہ سے تان کے کان گرو جی کی رسیلی اور دلکش آواز کے لئے ترس رہے ہیں ۔ آج تو میں خاص چیز سننے کے لئے چرنوں میں حاضر ہوا ہوں ۔"

" ہاں مگر ان دنوں طبیعت کچھ بدمزہ سی رہتی ہے ۔ اس لئے ہم گا تو نہیں سکیں گے ۔"

تان سین نے گھبرا کر کہا " زیادہ نہ سہی تھوڑا سا ہی سنا دیجئے ۔"

" آگرہ کے دربار میں جا کر اپنے استاد کے مزاج کو بھی

بھول گئے بیٹا!"

یہ صاف جواب سُن کر تان سین کے تو ہوش اُڑ گئے۔ کہ جس مطلب کے لئے بادشاہ اتنی مشقت کر کے آیا ہے۔ اگر حاصل نہ ہُوا۔ تو بہت ہی بُرا ہوگا۔ مگر یہاں بھی اس کی طبیعت کی تیزی اپنا کام کر گئی۔ فوراً ستار اُٹھا ایک نغمہ چھیڑ دیا۔ اور جان بوجھ کر غلطیاں کرنے لگا۔

باوا جی نے اپنے باکمال شاگرد کو جو یوں غلط سلط الاپتے دیکھا سخت برہم ہوئے۔ ٹوکا اور کہا "تان سین! یہ کیا کر رہے ہو؟"

تان سین نے پھر نئے سرے سے راگ شروع کیا۔ سوامی جی نے دوبارہ ٹوکا۔ اور ساتھ ہی غصے سے لال پیلے ہوگئے۔ کہا۔

" افسوس! تو نے میری ساری محنت برباد کر دی۔ میں سمجھے ہوئے تھا کہ میرے مرنے پر تان سین میری جگہ پُر کر دے گا۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا"

یہ کہہ کر ہاتھ بڑھا تان سین سے ستار چھین لی۔ اور پھر خود اس پر صحیح طریقے سے نغمہ سرائی کرنے لگے۔ اور ایسا

سماں باندھا۔ کہ ہر چیز پر سکوت کا عالم چھا گیا۔ پرندے اُڑنے سے رُک گئے۔ جمنا کی سیمابی لہروں نے اچھلنا اور تھرتھرانا بند کر دیا۔ شہنشاہ اکبر پر وجد کی حالت طاری ہو گئی۔ اس کی کنپٹیوں میں تناؤ سا پیدا ہو گیا۔ رگوں میں سرسریاں سی رینگنے لگیں۔ اور تان سین پر الگ روحانی کیف اور جسمانی خُمار چھا رہا تھا۔

نغمہ ختم ہو گیا۔ مہاراج نے ستار تان سین کے حوالے کی اور کہا "صاحب کمال اس طرح گایا کرتے ہیں"

اب تان سین کا مطلب حل ہو چکا تھا۔ اس نے سوامی جی کے چرنوں کو چھُو کر کہا۔

"مہاراج! یہ ستار بردار میرا ملازم نہیں بلکہ میرا آقا اور مملکتِ ہند کا ان داتا اکبر شاہ ہے۔ جس نے محض مہاراج کے درشنوں کی خاطر یہ روپ دھارن کیا ہے"

یہ سنتے ہی سوامی جی پر سب حال منکشف ہو گیا۔ فوراً کھڑے ہو گئے اور اکبر اعظم سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا ؎

زقدرِ شوکتِ سلطاں نہ گشت چیزے کم
زالتفاتِ بہ مہماں سرائے دہقانے

کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید
کہ سایہ برسرش افگند چوں تو سلطانے

اب نقلی ملازم اپنی اصلی شان میں نمودار ہو کر مسند پر براجمان ہُوا۔ متھرا میں ایک غلغلہ برپا ہو گیا۔ کہ سوامی جی سے ملنے کے لئے شہنشاہ اکبر بھیس بدل کر یہاں آیا ہے۔ گورنر نے اپنے خدم وحشم کے ساتھ حاضر ہو کر سلامی دی۔ توپیں سر ہوئیں۔ اور گھاٹ کے سادھوؤں کو انعام واکرام سے مالا مال کر دیا گیا۔

بادشاہ نے سوامی جی کو دربار کے نورتنوں میں داخل کرنا چاہا مگر اس آزاد منش سادھو نے اپنے بوڑھاپے اور گوشہ نشینی کا عذر پیش کر کے انکار کر دیا۔ اور کہا۔

"مہاراج مجھے شانتی سے بھگوان کی پوجا کرنے دیجئے"!

اس پر مغل اعظم نے زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا۔ جمنا کے گھاٹ پر سوامی جی کی اس ملاقات کی یاد تازہ کرنے کے لئے ایک حسین وجمیل مرمریں گپھا بنوا دی۔ اس کے بعد جب کبھی بادشاہ کو سوامی جی کے گانا سننے کی خواہش ہوتی۔ خود متھرا میں حاضر ہو کر اس کے کمالِ فن کی داد دیا کرتے۔ لیکن

اس کے باوجود نہ تو فن لطیف کا یہ جگت گرو کبھی اکبر کے دربار میں حاضر ہُوا۔ اور نہ بادشاہ نے کبھی اُسے آنے کی تکلیف دی۔

آہ! وہ کتنا بابرکت زمانہ تھا۔ جبکہ ایسے ایسے جلیل القدر شہنشاہ اپنی رعایا کے باکمال آدمیوں کو ملنے اور انہیں انعام سے نوازنے کے لئے بھیس بدل کر سفر کیا کرتے تھے۔ آہ۔ پریم اور شانتی کا وہ کتنا "سندر جگ" تھا۔ جبکہ ہندوستانی قومی اور نسلی امتیاز کے بغیر آپس میں شیر و شکر ہو کر گزارا کرتے تھے۔
لیکن افسوس آج زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ کہ بھائی بھائی کا دشمن ہو رہا ہے۔ اور بڑے بڑے صاحب کمال اپنے جگر پارہ دل کو ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ مگر کوئی دو پیسے کو بھی نہیں خریدتا ہے

این چہ شوریست کہ در دورِ قمر مے بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر مے بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرے بینم

بہ ناداں آنچناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

افیونی راجہ

"کاش یہ پہاڑ افیون ہوتا اس کو تالاب
میں گھول کر کسو بنایا جاتا۔ اور لوگ
چاروں طرف بیٹھ کر نوش کرتے"

"راجہ ہا کل واڑی"

۱

۱۷۸۵ء میں جب سلطان حیدر علی نے جنوبی دکن کو فتح کر لیا۔ تو علاوہ دیگر مقبوضات کے "ہاکل واڑی" کا علاقہ بھی اس کے تصرف میں آیا۔ یہ ایک ریاست تھی۔ جس کا راجہ عجیب و غریب خصائل کا مالک تھا۔ افیون کا غیر معمولی حریص اور مشتاق تھا۔ اپنے ملک کا جو مالیہ وصول ہوتا اس سے افیون خرید لیتا تھا۔ کوٹھے کے کوٹھے افیون سے پٹے پڑے تھے۔ کبھی محل سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ ہر وقت افیون کی پینک میں غرق رہتا۔ اس کے محل کے عقب میں ایک وسیع تالاب اور تالاب کے ورے ایک سر بفلک پہاڑ تھا۔ جب وہ تفریحاً اپنے محل کی چھت پر بیٹھتا۔ اور تالاب و پہاڑ کو دیکھتا تو ایک آہ سرد بھر کر درباریوں سے کہتا۔

" کاش یہ پہاڑ افیون ہوتا۔ اور اس تالاب میں گھول کر

کسو بنایا جاتا - اور لوگ چاروں طرف بیٹھ کر نوش کرتے ؛
جب مہارانی محل میں بلاتیں - تو خادمائیں گھنٹوں منت سماجت کرتیں - کہ "مہاراج اُٹھئے - رانی صاحبہ حضور کو یاد فرمارہی ہیں ؛" مگر راجہ صاحب "ہاں ابھی آئے ؛" "ابھی چلتے ہیں" کہتے کہتے پہروں گذار دیتے آخر باندیاں زبردستی اُٹھالیتیں - اور گھسیٹ گھساٹ کر محل میں لے جاتیں. تب رانی کے پاس بیٹھ کر قدرے قلیل شیر برنج کھاتا - اور اگر کبھی باغ کی سیر کو جی چاہتا - تو صبح سے چلتا اور اونگھتا ہُوا دوپہر تک باغ میں جا پہنچتا - حالانکہ فاصلہ فرلانگ بھر سے زیادہ نہ تھا - اس پر بھی راستے میں اگر ذرا نشہ سے آنکھ کھلتی - تو لونڈیوں سے پوچھتا - کہ "ہمیں محل سے نکلے کتنے روز ہو چکے ہیں - دیکھئے اب کب گھر پہنچنا نصیب ہو ؛"

ملازم عرض کرتے ہیں -

اگر حضور جلد جلد قدم اُٹھائیں - تو محل میں داخل ہونا چند قدموں سے زیادہ نہیں - اس پر وہ بے اختیار کھل کھلا کر ہنستا - اور کہتا

" جلد چلنا جانوروں کا کام ہے ؛"

۲

سلطان حیدر علی کو جب ان واقعات کا علم ہُوا ۔ تو اُسے اس کے دیکھنے کی خواہش ہوئی ۔ اور طلبی کا فرمان صادر کیا ۔

راجہ فرمان پڑھ کر سخت گھبرا اُٹھا ۔ کہ کس طرح دربار میں حاضری دے ۔ اور بات بھی سچی تھی ۔ جس نے عمر بھر محل سے باہر قدم نہ رکھا تھا ۔ وہ کیونکر اتنی تکلیف گوارا کرتا ۔

امیر وزیر نے منت سماجت کر کے راجہ کو پالکی میں بٹھا کر لے آئے ۔ سلطان اس کے دیکھنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا ۔ پالکی دیوان خاص میں اُتاری گئی ۔ چند مصاحبوں کے سہارے ہانپتے کانپتے راجہ صاحب پالکی سے برآمد ہوئے ۔ سلطان نے ہاتھوں ہاتھ لیا ۔ اور بغل گیر ہو کر اپنے تخت پر بٹھایا ۔ پوچھا آپ کے ملک کا کیا حال ہے ؟ اور خزانہ کی مقدار کیا ہے ؟

راجہ نے نہایت متانت سے جواب دیا ۔

"حضور کے اقبال سے کئی سو من افیون بھری پڑی ہے اور دودھ پینے کے لئے کئی سو گائیں موجود ہیں"

سلطان نے متبسم ہو کر فرمایا ۔" اچھا ہمیں نذر میں کیا ملے گا؟"

" آپ کو! راجہ ذرا سوچ میں پڑ گیا - اور پھر سر اُٹھا کر ہنسا - اور بولا -

" حضور والا - میری رانی آپ کی کنیز ہے - اور وہ ننگی بھی نہیں - کچھ زیور بھی اس کے پاس ہیں - اگر حکم ہو - تو حاضر کی جائے "!

سلطان بے اختیار ہنس پڑا - راجہ کو تو عزت و آبرو سے رخصت کیا - اور حکم دیا - کہ راجہ کی افیون کے لئے ایک عمدہ گاؤں علیحدہ کر کے باقی علاقے پر رانی کی نگرانی میں دیانتدار عملہ اور ناظم مقرر کیا جائے تاکہ سب کا سب ملک افیون کے نام سے برباد نہ ہو۔[1]

---

[1] اگر سلطان چاہتا - تو بد نظمی کا الزام لگا کر راجہ سے ملک چھین لیتا - لیکن اسلامی شرافت نے اس امر کو گوارا نہ کیا - بلکہ رانی کو مدار المہام بنا کر سارا علاقہ اس کی نگرانی میں دے دیا تاکہ افیونی بھی افیون کی پینک میں مست رہے - اور ملک کا نظام بھی قائم رہے -

(نور احمد خاں فریدی)

عرابتہ الاُولیٰ

"یہ اونٹ سازوسامان کے ساتھ حاضر
ہے۔ لے جائیں اگر مہربانی ہو سکے۔ تو
یہ تلوار جو میری کمر سے لٹک رہی ہے۔
مجھے عنایت کرتے جائیں۔ یہ حضرت علیؓ
کی نشانی ہے اور مجھے بے حد عزیز ہے"
(عبداللہ بن جعفرؓ)

(۱)

" واللہ۔ دنیا بھر میں عرابہ سے زیادہ سخی اور کوئی نہیں"
یہ ایک گرج دار آواز تھی۔ جو صحن کعبہ سے اٹھی۔ اور "بوقبیس" کی پہاڑی سے ٹکرا کر رہ گئی۔ اور ابھی حرم میں اس گونج کا اثر باقی تھا۔ کہ ایک اور آدمی کے بولنے کی آواز آئی۔ جو پہلے آدمی سے کہہ رہا تھا۔
عبیدہ! تم غلطی پر ہو۔ اس وقت دنیا میں رسولِ خدا کے چچا زاد بھائی عبداللہ بن جعفر ہی ہیں۔ جنہیں حاتم دوران کا لقب دیا جاسکتا ہے"
اس پر پہلا آدمی جس کا نام ہم عبیدہ سن چکے ہیں۔ برہم سا ہوگیا۔ اور بولا
عبیدہ:" عمر! ہرگز نہیں۔ عبداللہ لاکھ سخی سہی۔ مگر عرابہ سے لگا نہیں کھا سکتا۔ (نظریں عمر کے چہرے پر گاڑتے ہوئے)

سنتے ہو۔ آج جود و سخا میں "عرابہ" کا کوئی مثیل نہیں ہے"!

یہ دو آدمی اسی طرح ایک دوسرے سے سرد و گرم ہو رہے تھے۔ لیکن ان کے پاس کا تیسرا آدمی جس کی عمر پچاس برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ اور چہرے سے ضعیفی کے آثار ظاہر تھے۔ خاموش بیٹھا ان کی گرما گرم بحث دلچسپی سے سن رہا تھا۔ جب عبیدہ نے دیکھا۔ کہ عمر عرابہ کی فضیلت کا قائل نہیں ہوتا۔ تو اس نے تیسرے رفیق کی طرف معنی خیز نگاہ ڈالی اور کہا

عبیدہ۔ کیوں شیخ حارث! تمہارے نزدیک اس وقت کون شخص دنیا میں سب سے زیادہ فیاض ہے۔ عبداللہ بن جعفر یا عرابہ؟"

حارث نے مسکرا کر کہا۔ میں ان دونوں میں سے کسی کو بھی اس قابل نہیں پاتا۔ کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا سخی ثابت ہو سکے۔

عبیدہ نے تعجب سے اپنی نظریں حارث پر گاڑ دیں۔ اور کہا۔

تو کیا آپ کے نزدیک کوئی اور شخص زیادہ فیاض ہے؟"

"ہاں۔ میں قیس بن سعد کو سب سے زیادہ سخی جانتا

ہوں" حارث نے متانت سے جواب دیا۔

یہ جواب سن کر عمر تڑپ اُٹھا۔ اور کہا" حارث! میں تو عبیدہ پر افسوس کر رہا تھا۔ مگر تم تو اس سے بھی گئے گذرے ثابت ہوئے۔ میاں خدا خدا کرو۔ کہاں جعفر طیارؓ کے فرزند حضرت عبداللہ اور کہاں بچارا قیس۔ جو ان کی غلامی میں اپنی سعادت خیال کرتا ہے۔ ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک

حارث نے بگڑ کر کہا" تم بھی عجیب ہو۔ یہاں شرافت اور فضیلت کا کیا ذکر۔ بحث تو یہ ہو رہی ہے کہ سب سے بڑا فیاض کون ہے۔ اور آپ جناب قیس کے پیچھے اس لئے پڑ گئے۔ کہ وہ ابن جعفر کی عزت کیوں کرتے ہیں۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

اور ہاں یہ بھی ان کی فیاضی کی ایک بین دلیل ہے کیونکہ فیاض لوگ عام طور پر حلیم الطبع اور منکسر المزاج ہوتے ہیں"

عبیدہ نے حارث کو جھنجھوڑ کر کہا" ہاں مجھے اس امر کا اعتراف ہے۔ کہ قیس سخاوت میں عبداللہ سے کئی درجے بڑھ چڑھ کر ہے۔ مگر عرابہ کا درجہ ان دونو سے ارفع و اعلیٰ ہے"

حارث نے جواب دیا۔ واللہ۔ تم عرابہ کے معاملہ میں

مبالغہ سے کام لے رہو۔ وہ بے چارہ تو نابینا ہونے کی وجہ سے خود غیروں کا محتاج ہے دوسروں کی حاجت روائی کیسے کرسکتا ہے؟"

عبیدہ نے کہا اے حارث و عمر! تم دونو اپنے اپنے دعوئی میں دھوکہ کھا رہے ہو۔ عرابہ کی سخاوت اور بخشش تمام دنیا پر اظہر من الشمس ہے۔ تمہاری تکذیب سے اس کی شہرت میں کمی واقع نہیں ہو سکتی۔

قریب تھا۔ کہ یہ تینوں آپس میں الجھ پڑیں۔ اسی اثنا میں "بیر زمزم" کی جانب سے ایک آواز آئی۔

"بھائیو! لڑو جھگڑو نہیں۔ میں تمہارا ابھی فیصلہ کئے دیتا ہوں" ساتھ ہی ایک بزرگ جن کے چہرے سے زہد و تقویٰ کے آثار ظاہر تھے۔ صحن کعبہ میں داخل ہوئے۔ متوسط قد۔ نحیف جثہ۔ نورانی چہرہ۔ لمبی داڑھی۔ لبیں ترشی ہوئیں۔ پیشانی بلند اور کشادہ، ناک نہایت موزوں، آنکھیں علم اور مروّت کا پتہ دے رہی تھیں۔ سر پر عربی وضع کا ایک عمامہ باندھ رکھا تھا۔ ان حضرات نے جونہی اس پیر مرد کو دیکھا۔ فرط ادب سے کھڑے ہو گئے۔ کہا "خوب ہوا۔ عبداللہ بن عمرؓ

ہی آگئے ۔ کیا خوبیوں والا ہے ۔ ہمارا خدا جس نے ابن عمرؓ سا ثالث ہمارے لئے بھیجدیا۔"

عبداللہ۔ دوستو! ناحق لڑ رہے ہو۔ میں بڑی دیر سے تمہاری بحث سُن رہا تھا۔ واقعی تینوں بزرگ اپنی اپنی جگہ پر بے حد فیاض ہیں۔ مگر دلیل کے بغیر کسی ایک کے حق میں برتری کا فیصلہ کرنا بے انصافی ہے۔ اگر واقعی کسی کو ترجیح دینا ہے ۔ تو پھر آپ اپنے اپنے ممدوح کے پاس تشریف لے جائیں ۔ اور اپنے آپ کو مفلس و مسافر ظاہر کر کے امداد طلب کریں ۔ جو کچھ اُن سے ملے ۔ یہاں لے آئیں۔ اس سے ہم اندازہ لگائیں گے ۔ کہ کون سب سے زیادہ سخی ہے۔

حارث "آپ کا ارشاد بالکل بجا ہے "

عبیدہ " مجھے اس رائے سے اتفاق ہے "

عمرو" بالکل ٹھیک ہے "

ابن عمر ۔ بہتر ۔ میں یہاں بیٹھا تمہارا انتظار کروں گا۔ حضرت کے فیصلہ پر تینوں عرب اُٹھ کر چل دئے ۔

(۲)

عمرو یہاں سے نکل کر سیدھا حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے درِ دولت پر پہنچا۔ آپ اس وقت دمشق جانے کے لئے اونٹ پر سوار ہو رہے تھے۔ ابھی پاؤں رکاب میں رکھا ہی تھا۔ کہ عمرو آتا دکھائی دیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

عبداللہ۔ فرمائیے۔ کیسے آنا ہوا؟"

عمرو۔ (مؤدبانہ انداز میں) اے سرورِ عالم کے چچا زاد بھائی! میں سفر میں ہوں اور سخت محتاج ہوں۔ میری امداد فرمائیے!"

یہ سن کر حضرت عبداللہ اونٹ سے اتر آئے۔ اور فرمایا

"یہ اونٹ ساز و سامان کے ساتھ حاضر ہے۔ لے جائیں اگر مہربانی ہو سکے۔ تو یہ تلوار جو زین سے لٹک رہی ہے۔ عنایت کرتے جائیں۔ کیونکہ یہ حضرت علیؓ کی نشانی ہے۔ اور مجھے بے حد عزیز ہے"۔

عمرو نے تلوار کھول کر دے دی۔ اور خود اونٹ کی مہار تھامے کعبے کو روانہ ہوا۔ راستے میں خیال آیا۔ کہ دیکھیں تو سہی اونٹ پر کیا کچھ ہے۔ بٹھا کر پڑتال کی۔ تو چند ریشمی صدریاں اور چار ہزار اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ یہ دیکھ کر بے حد مسرور

ہوا۔ اور شاداں و فرحاں کعبہ کو چل دیا۔

(۴)

حارث جس وقت قیس بن سعد کے ہاں پہنچا۔ وہ اس وقت بستر پر لیٹے آرام کر رہے تھے۔ ان کے غلام نے تعظیم کے ساتھ بیٹھنے کو جگہ دی۔ اور کہا۔

غلام: "آپ میرے آقا سے کیا چاہتے ہیں ؟"

حارث۔ میں مسافر آدمی ہوں۔ زادِ راہ ختم ہو چکا ہے۔ آپ کے آقا خدا ترس آدمی ہیں۔ اس لئے امداد چاہنے آیا ہوں۔

غلام۔ واقعی میرے آقا بڑے نیک دل اور فیاض انسان ہیں۔ لیکن اس وقت وہ آرام فرما رہے ہیں۔ مگر آپ کو میں انتظار میں رکھنا نہیں چاہتا۔

یہ کہہ کر غلام اندر گیا۔ اور سات ہزار اشرفیوں کا توڑا اٹھا لایا۔ کہا گھر میں اس وقت کوئی پیسہ بھی نہیں۔ جو کچھ تھا حاضر کر دیا گیا ہے۔ ہاں اونٹوں کے محافظ کے پاس یہ نشانی لے جائیے۔ ایک خادم اور ایک اونٹ آپ کو دے دیگا۔

حارث شکریہ ادا کر کے "مروہ" کی طرف اونٹ لینے چلا گیا۔

پیچھے جس وقت قیس نیند سے بیدار ہوا۔ غلام سے حقیقتِ حال

سن کر اس قدر خوش ہُوا۔ کہ اُسی وقت اُسے آزاد کر دیا۔ اور کہا اگر تم مجھے بیدار کر دیتے۔ تو شاید میں سائل کی اس سے زیادہ خدمت کر سکتا۔

(۴)

عُبیدہ نہایت سرعت سے قدم بڑھاتا ہُوا عرابہ کے مکان پر پہنچا۔ پتہ لگا کہ وہ نماز ادا کرنے کے لئے مسجد کو روانہ ہو چکے ہیں۔ یہ بھی ان کے تعاقب میں مسجد کو چل پڑا۔ اور راستے ہی میں جا لیا۔ عرابہ بچارا آنکھوں سے تو معذور تھا۔ سلام ن کر ٹھٹک گیا۔ عبیدہ نے عرض کی۔

اے حاتمِ دوران! میں ایک غریب الدیار انسان ہوں پیسہ پاس نہیں۔ آدمی کوئی واقف نہیں۔ لہٰذا امداد فرمائیے۔"

عرابہ نے یہ سُن کر سر پیٹ لیا۔ اور کہا۔

میں کیسا بد نصیب ہوں۔ سائل اُس وقت امداد کا طالب ہُوا۔ جب میں خالی ہاتھ تھا۔ آہ۔ اب میں کیا کروں۔ ؎

صائبا خجلت سائل بزمینم در کرد
بے زری کرد بمن آنچہ بقاروں زر کرد

پھر عبیدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ بھئی افسوس ہے

کہ اس وقت میں نقدی سے تمہاری امداد نہیں کر سکتا۔ یہ دو غلام جو میرے ہاتھ تھامے جا رہے ہیں۔ اگر آپ منظور کر لیں۔ تو میں بے حد شکر گذار ہوں گا۔

عبیدہ عرابہ کے اس ایثار سے حیران رہ گیا۔ اور کہا میں آپ کو ناجائز تکلیف دینا نہیں چاہتا۔

مگر عرابہ نے بہت اصرار کیا۔ اور کہا۔ اگر تم ان غلاموں کو قبول نہ کرو گے۔ تو میں انہیں آزاد کر دوں گا۔

عبیدہ نے مجبور ہو کر غلاموں کو اپنے ساتھ لے لیا۔ اور درخواست کی۔ کہ اگر اجازت ہو۔ تو میں آپ کو مسجد تک پہنچا دوں "۔ عرابہ نے جواب دیا۔ نہیں۔ مسافروں سے خدمت لینا شرفا کا کام نہیں ہے۔ یہ کہا اور ہاتھوں سے دیوار ٹٹولتا مسجد کو روانہ ہوا۔

(۵)

حضرت ابن عمرؓ حرم کعبہ میں بیٹھے سوچ رہے تھے۔ کہ ان تینوں اصحاب میں سے کون اپنے دعویٰ میں سچا اترتا ہے کہ عمرو داخل ہوا۔ اور کہا " السلام علیک یا ابن خلیفہ رسول اللہ " حضرت نے فرمایا۔ وعلیکم السلام یا اخی۔ کیا کچھ لائے ؟ "

عمرو نے سامان پیش کرتے ہوئے کہا۔ جناب ایک اُونٹ چار ہزار اشرفی اور کچھ ریشمی صدریاں۔ اس وقت میرا ممدوح اونٹ پر سوار ہو کر سفر کو جا رہا تھا۔

حضرت نے فرمایا "بہت خوب"

اتنے میں حارث بھی آ پہنچا۔ حضرت کی نگاہیں اس طرف اُٹھ گئیں۔ مسکرا کر فرمایا "حارث بتاؤ۔ تمہیں کیا کچھ ملا؟"

"جناب! سات ہزار اشرفی، ایک اونٹ اور ایک غلام، اور یہ چیزیں میرے ممدوح کے خادم نے عطا کی ہیں۔ وہ اُس وقت سو رہا تھا"

"لو عبیدہ بھی آ گئے" عمرو نے دائیں طرف جھانکتے ہوئے کہا۔

"السلام علیک یا اصحاب رسول اللہ" عبیدہ نے داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اور اس کے ساتھ دو غلام تھے۔

ابن عمر نے فرمایا "کیا لائے؟"

عبیدہ نے التماس کی "جناب عالی میرا ممدوح اس وقت نماز پڑھنے کے لئے مسجد کو جا رہا تھا۔ میں نے راستے ہی میں اس کو جا لیا۔ بیچارا رونے لگ گیا۔ کہ کاش میرے پاس

نقدی ہوتی تو سائل کو دیتا۔ یہ کہہ کر دو نو غلام مجھے بخش دئے
اور خود ہاتھوں سے راستہ ٹٹولتا مسجد کو روانہ ہو گیا۔

حضرت ابن عمرؓ نے بے ساختہ کہا "یہ ایثار ہے۔ اے
حارث! وا اے عمرو!! تمہارا دوست تم سے بازی لے گیا!"

حارث نے عرض کی۔ واقعی عرابہ کا درجہ فیاضی میں
سب سے بڑھ کر ہے۔

عمرو نے کہا بالکل بجا۔ اس وقت عرابۃ الاوسی سے بڑھ کر
کوئی فیاض نہیں۔
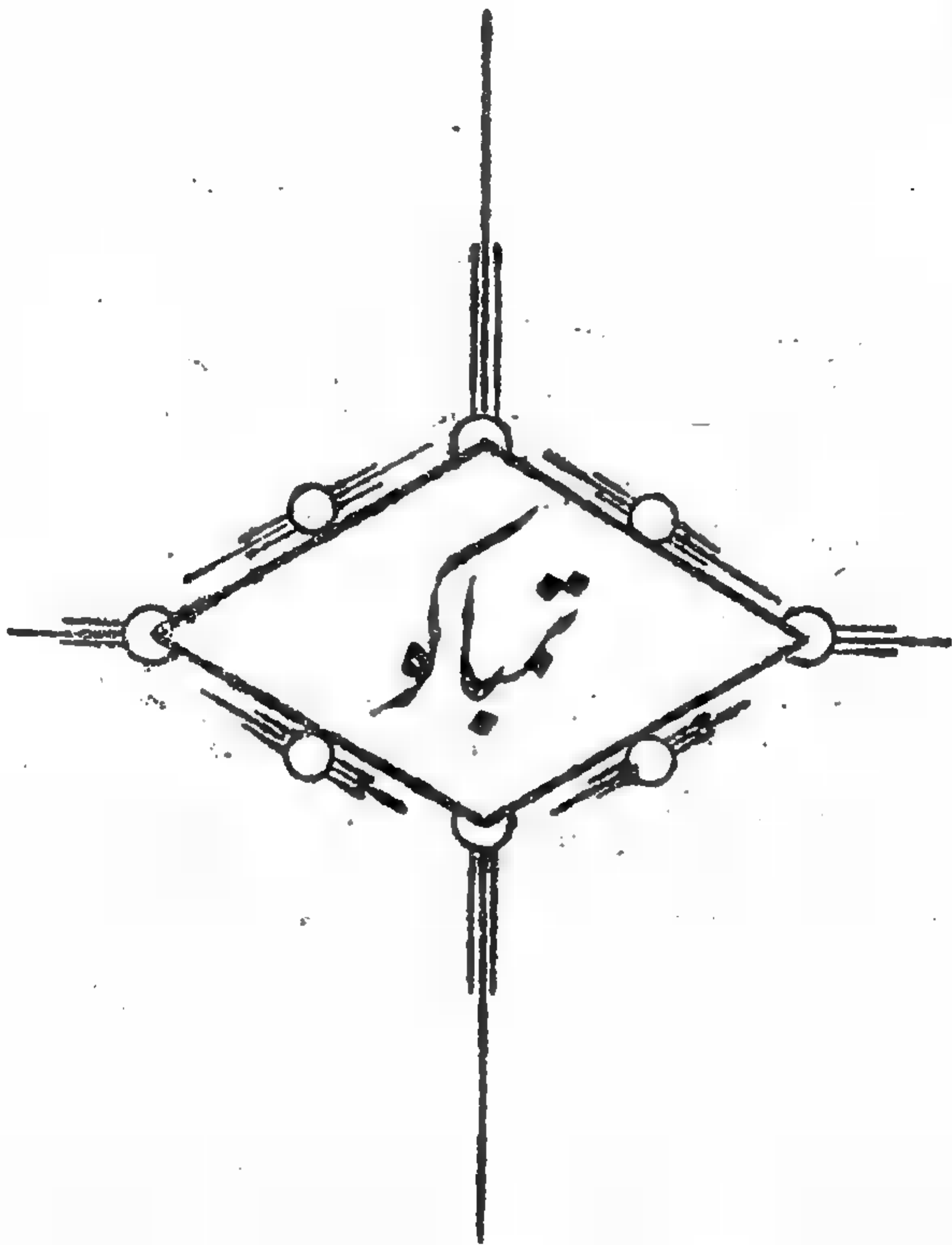
تمباکو

"چونکہ تمباکو کا بہت سے آدمیوں کی صحت اور دماغ پر بُرا اثر پڑا ہے اس لئے ہم نے حکم دیا ہے کہ کوئی شخص حقہ نوشی کی عادت نہ ڈالے۔"

"جہانگیر اعظم"

(۱)

اسد بیگ کو بیجاپور میں آئے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ اکبر اعظم نے اُسے شاہ بیجاپور کی خدمت میں اِس لئے بھیجا تھا۔ کہ وہ اِس سے شہنشاہ کے کسی فرزند کے لئے لڑکی کا رشتہ طلب کرے۔

اس نے بازار میں چند آدمیوں کو حقہ پیتے دیکھا چونکہ اسد بیگ نے عمر بھر میں کبھی حقہ کو نہ دیکھا تھا۔ وہ اس کی شکل وصورت سے۔ بے حد متعجب ہُوا۔ اور اس خیال سے کہ اس تحفہ کو شہنشاہ کی خدمت میں لے جائے۔ تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ بڑے شوق سے ایک انگریز سے جا ملا۔ جو بیجاپور میں حقے اور تمباکو کا پہلا سوداگر تھا۔ اس سے کچھ تمباکو خریدا۔ پھر ایک نہایت ہی دل پسند حقہ تیار کرایا۔ اس کا پیندا بہت خوبصورت تھا۔ اور اُسے ہیرے جواہرات اور مینا کاری سے مرصّع کیا گیا۔ حسنِ اتفاق سے اسد بیگ کو عقیق یمنی کی چہال عمدہ اور بیضوی مل گئی۔

اسے نیچے پر چڑھالیا۔ چلم خالص سونے سے تیار کی گئی۔ اور نیچہ کو سرخ مخمل سے منڈھوایا۔ تاکہ حقہ ہر طرح سے حسین و جمیل نظر آئے۔

اسد بیگ اس مہم سے بامراد اور شاد کام واپس لوٹا۔ اور اپنے ساتھ شہنشاہ کے لئے بہت سے تحفے بھی جمع کر لایا۔ جب انہیں سجا کر دربار میں پیش کیا۔ تو بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اور اسد بیگ سے فرمایا۔

"تو نے اتنی چیزیں اس تھوڑے سے عرصہ میں کیسے جمع کر لیں !"

اتنے میں بادشاہ کی نظر حقے پر پڑی۔ اس کی عجیب و غریب شکل دیکھ کر پھڑک اٹھا۔ قریب منگوا کر غور سے ملاحظہ فرمایا۔ تمباکو کا میگزین نیچے کا واٹر ورکس، دلفریب اور دلکش نلی ہر چیز پہ بار بار نظر ڈالی۔ اور تمباکو کی طشتری کو غور سے دیکھتے ہوئے اسد بیگ سے کہا۔

"میاں ! یہ کیا چیز ہے اور یہ سب کارخانہ کس لئے ہے !"

نواب خان اعظم نے مسکرا کر نہایت ہی لطیف انداز میں جواب دیا۔

جہاں پناہ! یہ تمباکو ہے جو کہ مدینہ اور اس کے نواح میں ملتا ہے۔ اور یہ صاحب دوا کے طور پر حضور کی خاطر لائے ہیں۔

شہنشاہ نے مسکرا کر اسد بیگ پر اپنی کیمیا اثر نظر ڈالی اور فرمایا۔

"حقہ بھر کر پیش کیا جائے"

چنانچہ بر سر دربار حقّہ کے میگزین میں تمباکو رکھا گیا۔ بتی کو آگ دکھائی گئی۔ جس سے چلم روشن ہو گئی۔ حقہ کو تخت کے قریب مناسب جگہ پر رکھ دیا گیا۔ شہنشاہ نے ہاتھ بڑھا کر نہال کو پکڑا۔ اور بائیں طرف اپنے خاص حکیم کی طرف توجہ فرمائی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ" یہ غلام جہاں پناہ کو حقہ پینے کا مشورہ نہیں دے سکتا"

اکبر اعظم نے مسکرا کر اسد بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر ہم اسد بیگ کی خاطر اسے ضرور پئیں گے"

یہ کہہ کر حقے کی نہال اپنے منہ میں لے کر دو تین کش لگائے اس پر حکیم صاحب نے گھبرا کر عرض کی

"ظل اللہ! غلام پر رحم فرمائیں - اور اس بلا کو منہ نہ لگائیں"
بادشاہ نے حقہ اپنے منہ سے نکالتے ہوئے خانِ اعظم سے کہا "آؤ اس کی آزمائش کریں" تھوڑا سا تمبا کو عطار شاہی کے آگے رکھا گیا - کہ دیکھ کر اس کے خواص بیان کرے -
عطار بولا - ہماری کتابوں میں اس کا کہیں ذکر نہیں آیا - یہ کوئی نئی چیز معلوم ہوتی ہے - حقے پر غور سے نظر ڈالتے ہوئے کہا - اس کا پیندا تو چین کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے - اور یہ ایک نادر چیز ہے -
حکیم صاحب نے بڑھ کر عرض کی -
"جہاں پناہ! تمبا کو ایک نا آزمودہ دوا ہے - اس کے بارے میں متقدمین نے کچھ نہیں لکھا - ایسی چیز جس کے حق میں ہماری کتابیں خاموش ہوں اور ہمارے بزرگوں نے کچھ رائے نہ دی ہو - اس کا استعمال کیسے کیا جا سکتا ہے ! اور پھر اعلیٰحضرت جیسے شہنشاہ کے لئے تو کسی صورت بھی مناسب نہیں - کہ ایسی مشتبہ چیز کی آزمائش فرمائیں"
اسد بیگ غصہ سے تلملا اٹھا - حقّے کو بڑی محنت سے لایا تھا - اور اس پر اس کی بڑی رقم خرچ ہوئی تھی - اس نے

جھنجھلا کر حکیم سے کہا۔ کہ

" انگریز ایسے ناتجربہ کار نہیں ہیں۔ کہ انہیں اس بارے میں کامل واقفیت نہ ہو۔ اور انگریزوں میں ایسے عاقل اور دانا ہیں۔ جو شاذ و نادر غلطی کرتے ہیں۔ تم آزمائش کئے بغیر اس کے خواص کیسے جان سکتے ہو؟ اور اس کے متعلق اپنی ایسی رائے کیسے دے سکتے ہو۔ جس پر تمام بڑے بڑے عالم فاضل بھروسہ کر سکیں کسی چیز کی خوبی اور بُرائی تجربہ کے بغیر کیسے معلوم ہو سکتی ہے"۔

حکیم صاحب نے دربار کے آداب کا لحاظ کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ کہ "ہم انگریزوں کی نقل کرنا اور اس رسم کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔ جس کی ہمارے بزرگوں نے اجازت نہ دی ہو"۔

اسد بیگ نے تُنک کر کہا۔ کہ "واقعی تمباکو عجیب و غریب چیز ہے۔ لیکن دنیا میں ایسی کونسی شے ہے۔ جو حضرت آدم سے آج تک کسی نہ کسی زمانہ میں عجیب و غریب نہ سمجھی گئی ہو۔ اور وقتاً فوقتاً ایجاد نہ ہوئی ہو۔ جب کوئی چیز دنیا میں مشہور ہو جاتی ہے۔ تو ہر شخص بغیر کسی خوف اور خطرے کے اُسے

استعمال کرنے لگتا ہے۔ عقلمند لوگوں کو کسی چیز کی خوبیوں اور عیبوں پر پوری طرح سے غور و فکر کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں۔ کہ کسی چیز کی خوبیاں یکبارگی ظاہر ہو جائیں۔ مثلاً دار چینی جو پہلے زمانے میں معلوم نہ تھی۔ حال ہی میں دریافت ہوئی ہے۔ اور بہت سے امراض میں کام آتی ہے۔

جب شہنشاہ نے اسد بیگ کو دلیرانہ وار مناظرہ اور مباحثہ کرتے دیکھا۔ تو وہ بے حد حیران ہوا۔ اور خوش ہو کر اسے تحسین و آفرین کی۔ اور خانِ اعظم سے فرمایا۔

"تم نے سُنا کہ اسد بیگ نے کیا عقلمندانہ تقریر کی ہے۔ یہ درست ہے۔ کہ اگر ہم کسی ایسی چیز کو کتابوں میں نہ پائیں جسے دوسری قوم کے عقلمند لوگ استعمال کرتے ہیں۔ تو ہمارے لئے یہ مناسب نہیں۔ کہ ہم اس کا استعمال نہ کریں۔ اور اُسے تجربہ میں نہ لائیں۔

حکیم صاحب ابھی کہنا ہی چاہتے تھے۔ کہ بادشاہ نے روک دیا۔ چونکہ اسد بیگ اپنے ہمراہ کافی تمباکو لایا تھا۔ اس لئے اُس نے بہت سے امیروں وزیروں میں اُسے تقسیم کیا۔ اگرچہ

شہنشاہ نے پسر بھول کر بھی حقہ کو منہ نہ لگایا۔ لیکن خانِ اعظم کو ایسی لت پڑی۔ کہ عمر بھر اس کا پانی بھرتے رہے۔ خواص سے اس کا رواج عوام تک پہنچا۔ اور اس کی مانگ دیکھ کر انگریزدل نے بیچنا شروع کیا۔ ممالک متوسط۔ اکبر آباد اور الہ آباد کے صوبوں میں اس کی کاشت شروع ہوئی۔ جہانگیر کے زمانے میں آسے ہر شخص پینے لگا۔ اس نے اس کے انسداد کی بہت کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

"چونکہ تمباکو کا بہت سے آدمیوں کی صحت اور دماغ پر بُرا اثر پڑا ہے۔ اس لئے ہم نے حکم دیا ہے کہ کوئی شخص حقہ نوشی کی عادت نہ ڈالے"

جہانگیر نے حقہ نوشی کو روکنے کے لئے سخت احکام صادر کئے۔ بلکہ اس جرم میں لاہور شہر کے اندر بعض کے ہونٹ بھی کاٹے گئے۔ اس پر بھی لوگ چھُپ چھُپ کر پیتے تھے۔ جب اس نیک دل اور رعایا پرور سلطان نے دیکھا۔ کہ رعایا اس بلا کو نہیں چھوڑ سکتی۔ تو وہ خاموش ہوگیا۔ اس کا یہ شراب تک متداول چلا آتا ہے۔ ؎

بسیار کسے کہ خواہد ش از دل وجان بہر کمیاب کسے بود کہ اورا کم خواست

جلال اُن کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

خواجہ احمد ایاز

اس سے خواجہ کے چہرے پر یاس اور قنوط
کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مگر فوراً سنبھلا اور سنبھل کر
بولا میرے جان سپار دوستو!
"کیا اس بڑھاپے میں میرے لیئے
مناسب ہے کہ قیامت کو روسیاہی کا داغ
چہرے پر لے کر قبر سے اٹھوں! اب میں
رضائے الٰہی پر راضی ہو چکا ہوں۔ جو خدا
کو منظور ہو گا وہی ہو کر رہے گا۔"
(احمد بن ایاز)

(۱)

خواجہ جہاں، ملک احمد ایاز، وزیرِ اعظم ہندوستان عصر کی نماز پڑھ کر جامع تغلق سے باہر نکل رہا تھا۔ کہ اُسے جمنا گھاٹ کی طرف سے ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہُوا نظر آیا۔ ان دنوں سلطان محمدؒ گجرات کی مہم پر گیا ہُوا تھا۔ اور ملک احمد اُس کی عدم موجودگی میں بطور نائب السلطنت کام کر رہا تھا۔ عرصہ سے بادشاہ کی خیر خیریت کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ جس سے اس نمک خوار وزیر کی طبیعت پژمردہ سی رہتی تھی۔ اب جو دُور سے گرد اُڑتی نظر آئی۔ تو ٹھٹک کر رہ گیا۔

اب سوار قلعہ کے دروازے کے قریب آگیا تھا۔ خواجہ جہاں نے ایک امیر سے کہا۔ پتہ کرو یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟

تھوڑی دیر بعد امیر نووارد کو ہمراہ لے کر حاضر ہُوا۔

سوار نے مُنہ پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔ کپڑوں پر گرد کی تہیں

جم رہی تھیں۔ سفر کی کلفت سے چُور چُور ہوا جاتا تھا۔ اس نے آتے ہی ڈھاٹا کھول دیا۔ اور خواجہ جہاں کے قدموں پر گر پڑا۔

"اوہ۔ کون۔ التون؟ میرا محبوب غلام!!"

خواجہ جہان نے فکر مند ہو کر کہا۔

"لشکر شاہی کو کیسے چھوڑا؟"

"میں خلوت میں عرض کروں گا۔ میرے آقا" غلام نے ہانپتے ہوئے عرض کیا۔

خواجہ جہان التون کو ہمراہ لے کر فوراً ایک گوشے میں پہنچا اور کہا "جو کچھ کہنا ہو۔ جلد جلد کہہ ڈالو"

التون نے رازدارانہ طور پر کہنا شروع کیا۔

"میرے آقا! آپ کا سلطان دنیا سے چل بسا۔ مغلوں نے لشکر لوٹ لیا۔ تاتار خاں اور فیروز خاں گم ہیں خدا معلوم مغلوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے یا کہیں مارے گئے"

فرطِ غم سے خواجۂ جہاں بے قرار ہو گیا۔ مگر دامنِ صبر کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ زیر لب انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ اور کہنے لگا۔ "اے غلام تو نے بڑی منحوس خبر سنائی"

التون "خداوند نعمت! تقدیر سے چارہ نہیں"
خواجہ جہان۔ سلطان نے کب اور کہاں انتقال کیا؟
التون۔ اے خواجہ جہان! ہندوستان کے شہنشاہ نے ۲۱ر محرم ۷۵۲ھ کو ٹھٹھہ کے مقام پر اپنی جان "جان آفرین" کے سپرد کی۔
خواجہ جہان "کچھ وصیت کا بھی علم ہوا؟"
التون۔ اتنا سنا گیا تھا۔ کہ سلطان نے فیروز خاں کو اپنی رعایا پر شفقت کرنے کی تلقین کی اور مرنے سے پہلے یہ اشعار پڑھے۔ ؎

بسیار دریں جہاں چمیدیم　　بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپان بلند بر نشستیم　　ترکان گرانبہا خریدیم
کردیم بسے نشاط آخر
چوں قامتِ ماہِ نو خمیدیم

"آہ! سلطان تیرا وجود بھی ایک طوفان تھا" یہ کہہ کر خواجہ جہاں ٹھنڈے سانس بھرتا ہوا دیوان خاص میں آیا۔ اور امرائے دولت کو اس سانحہ سے مطلع کر کے ماتم میں ہو بیٹھا۔ اس وقت خواجہ کو دوگنا غم تھا۔ ایک تو بادشاہ کے مرنے کا اور دوسرا فیروز خاں کی

گمشدگی کا۔ کیونکہ خواجہ جہاں فیروز خاں سے دلی محبت کرتا تھا۔ اور سلطان کی وصیت کے بموجب اسی کو ہی تاج و تخت کا مالک دیکھنا چاہتا تھا۔

چند یوم اسی طرح گذر گئے۔ فیروز خاں کی کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی۔ فتنہ و فساد کے ان ایام میں تخت کا بادشاہ سے محروم رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لئے خواجہ جہاں نے سلطان مرحوم کے فرزند کو تخت نشین کر دیا۔ اور خود کاروبار سلطنت کو نہایت مستعدی سے سرانجام دینے لگا۔

ابھی تھوڑے ہی دن گذرے تھے۔ کہ ایک دن اطلاع آئی کہ سلطان فیروز تخت پر بیٹھ چکا ہے۔ اور پایہ تخت کی طرف بڑھا چلا آتا ہے۔ خواجہ جہاں کو شہزادے کے تخت نشین کرنے پر افسوس ہُوا۔ مگر اب غلطی ہو چکی تھی۔ اس لئے اُس نے مصلحت اسی میں دیکھی۔ کہ آنے والے خطرہ کے لئے لشکر تیار رکھے۔ اور جب تک صلح کی کوئی صورت نہ نکلے۔ بے فکر نہ رہے۔ چنانچہ اس نے بیس ہزار کے قریب فوج فراہم کر لی۔ مگر خزانہ تو ستائیس سالہ بذل و سخا کے سبب خالی ہو چکا تھا۔ اور اگر کچھ تھا بھی تو چند دنوں میں ختم ہو گیا۔ اس لئے خواجہ نے تالیف قلوب کے لئے سونے چاندی کے برتن

اور جواہرات دینے شروع کئے۔ لیکن چونکہ سلطان فیروز نہایت فیاض اور عدل پرور نوجوان تھا۔ اس لئے رعایا اس کی حکومت کی خواہاں تھی۔ نتیجہ یہ نکلا۔ کہ امراء اور اکابر سلطنت ادھر کو بھاگنے لگے۔ جب خواجہ جہاں نے لوگوں کے اس میلان کو دیکھا۔ تو اُسے بادشاہ سے مقابلہ کرنا سود مند نظر نہ آیا۔ لہذا اپنی جمعیت کو ہمراہ لے کر ہانسی جا پہنچا۔ ہواخواہ امرا نے حاضر ہو کر عرض کی کہ آپ تو سلطان فیروز کی خدمت میں جا رہے ہیں۔ ہمارے متعلق کیا حکم ہے؟"

خواجہ جہاں نے فرمایا "اے یارانِ بے ریا۔ سلطان محمدؒ کے بیٹے کو بادشاہ بنانے میں میری کوئی ذاتی طمع مضمر نہ تھی۔ جب میں نے سُنا۔ کہ سلطان نے وفات پائی۔ لشکر کو مغلوں نے لوٹ لیا۔ اور تاتار خاں و فیروز خاں وہاں سے غائب ہیں۔ تو میں نے ملک کی بھلائی اور خلق کی بہبودی کی خاطر محمد شاہ کے فرزند کو بادشاہ بنا دیا۔ میں نے بہت سی خطائیں اور غلطیاں کی ہیں مگر وہ سب خلق کے دباؤ اور شور و غل سے۔ وگرنہ مجھے بادشاہی سے کیا کام تھا۔ میں سلطان فیروز کو محمد شاہ کے عہد میں بیٹا کہتا تھا۔ اور وہ مجھ کو باپ۔ میری بہو بیٹیاں اس کے گھر

میں جاتی تھیں۔ اگرچہ میں نہیں جانتا۔ کہ خدا کو کیا منظور ہے۔ مگر سلطان فیروز نیک مرد ہے۔ مجھے بھی اور تم کو بھی معاف کر دے گا"

خواجہ جہاں اسّی سال کا پیر مرد۔ جس کے سر کے بال برف کی طرح سفید ہو چکے تھے۔ یہ کہہ رہا تھا۔ اور اس کے خیر سگال دوست رو رہے تھے۔ جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو انہوں نے متفق ہو کر عرض کیا۔

اے خواجہ جہاں! بادشاہوں کا یہ دستور ہے کہ امورِ حکومت میں باپ بیٹے کے تعلقات کی پرواہ نہیں کرتے۔ سہو اور غلطی میں تمیز نہیں کرتے۔ فیروز شاہ لاکھ نیک مرد سہی۔ مگر وہ دستور قدیم کے خلاف نہ چلے گا۔

اس سے خواجہ کے چہرے پر یاس اور قنوط کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مگر فوراً سنبھلا۔ اور سنبھل کر بولا "میرے جان سپار دوستو! اگر میں واپس دہلی جا کر قلعہ بند ہو بیٹھوں تو گرچہ میرے پاس لشکر اور ہاتھی بکثرت موجود ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سلطان فیروز دہلی کو فتح کر لے گا۔ اس سے مسلمانوں کی عورتیں نااہلوں کے ہاتھ پڑیں گی۔ کیا اس بڑھاپے میں میرے لئے

مناسب ہے۔ کہ قیامت کو روسیاہی کا داغ چہرے پر لے کر قبر سے اٹھوں۔ اب میں رضائے الٰہی پر راضی ہو چکا ہوں۔ جو خدا کو منظور ہوگا وہی ہو کر رہے گا"

امراء نے جب دیکھا۔ کہ خواجہ جہاں سلطان کے دربار میں جانے پر مُصر ہے۔ تو کئی واپس لوٹ گئے۔ اور کئی اس کے ہمراہ روانہ ہوئے۔

(۲)

ظہر کا وقت تھا۔ فیروز بخت سلطان فتح آباد میں کرسی پر بیٹھا دربار کر رہا تھا۔ کہ دور سے خواجہ جہاں اس ہیئت میں آتا ہوا دکھائی دیا۔ پگڑی سر سے اتری ہوئی۔ سر ننگا اور منڈا ہوا۔ تلوار برہنہ مگر گلے میں حمائل۔ شرافت مجسم سلطان نے فوراً ایک امیر کو بھیجا۔ کہ جا کر پگڑی بندھوائے۔ اور چوڈول زرّین جو خاص اس کی سواری کا تھا۔ بھیجکر ہدایت کی۔ کہ خواجہ جہاں کو باغ کے تختہ میں بٹھایا جائے۔ میں وہیں ملاقات کو آتا ہوں۔

امرائے دربار نے جو علی الاعلان خواجہ کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ بادشاہ کو ادھر جھکتے دیکھا تو سب نے دست بستہ عرض کی۔ خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ بادشاہ ہو گئے۔

دہلی بھی فتح ہوگئی۔ اور خواجہ جہان بھی خدمت میں پہنچ گیا۔ اب کسی قسم کا خدشہ نہیں رہا۔

مسلمان پر ایک حج فرض ہوتا ہے۔ جہاں پناہ ہم سب کو حج کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔"

سلطان ان کا مطلب سمجھ گیا۔ مسکرا کر بولا "جب کبھی امیروں وزیروں سے لغزش ہوئی ہے۔ گذشتہ سلاطین نے ہمیشہ ان سے درگذر کی ہے۔"

انہوں نے عرض کی "ولی نعمت! گناہ دو طرح کے ہیں۔ ایک کبیرہ دوسرے صغیرہ۔ صغیرہ گناہ معاف کر دیئے جائیں تو کچھ قباحت نہیں۔ مگر کبیرہ گناہوں سے درگذر کرنے میں انجام کار بڑی پشیمانی ہوتی ہے۔ خواجہ جہاں نے دنیاوی لالچ سے ایک معصوم بچے کو تخت پر بٹھا دیا۔ خزانہ کا سارا روپیہ برباد کر دیا۔ اور جب کچھ نہ رہا۔ تو سونے چاندی کے برتن اور جواہر دے ڈالے اس پر بھی جب رعایا کو اپنا طرفدار نہ بنا سکا۔ تو مجبوراً جہاں پناہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اگر آپ سے ہم پر غلبہ حاصل ہوتا۔ تو کسی کو زندہ نہ چھوڑتا۔

جو ہماری سمجھ میں آیا عرض کر دیا۔ آگے بادشاہ کو اختیار ہے۔"

(۳)

بادشاہ خواجہ جہاں کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اور اسے شہزادگی کے زمانہ میں ابا کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ جب دیکھا کہ سارا دربار اس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ دربار برخاست کر کے خواجہ جہاں سے ملاقات کی اور پھر محلسرا میں چلا گیا۔

اس صدمہ نے فیروز شاہ کے قلب و دماغ پر اتنا برا اثر ڈالا کہ وہ بیمار ہو گیا۔ اور کئی دن تک باہر نہ نکلا۔ آخر کار ایک دن عماد الملک کو بلا کر کہا "میں خواجہ جہاں کا معاملہ تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ جو مناسب معلوم ہو کرو۔" عماد الملک نے دست بستہ عرض کی کہ "خواجہ شمع سحری ہو رہا ہے۔ اسے سامانہ کا موضع جاگیر میں دے کر رخصت کر دیا جائے۔ تاکہ باقی عمر عبادت الٰہی میں بسر کرے۔"

خواجہ جہاں اپنے متعلق یہ حکم سن کر سامانہ کو چل پڑا۔ لیکن ابھی چند منزلیں طے کی تھیں۔ کہ عقب سے شیر خاں آ ملا۔ خواجہ نے معلوم کر لیا۔ کہ یہ میرے لئے عزرائیل بن کر آیا ہے۔ کہا

"ذرا مجھے دوسرے خیمے تک جانے کی اجازت دی جائے"

وہ اس میں جا کر نماز پڑھنا چاہتا تھا۔ شیر خاں نے اجازت دے دی۔ خواجہ فی الفور خیمہ میں پہنچا۔ وضو کر کے نماز شروع کرنا چاہتا تھا۔ کہ قاتل ننگی تلوار ہاتھ میں لئے داخل ہوا۔

خواجہ اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔ پوچھا "تمہاری تلوار تیز ہے؟" قاتل نے تلوار دکھائی۔ خواجہ نے الٹ پلٹ کر غور سے دیکھی اور پھر واپس کر دی۔ کہا "جب میں نماز سے فارغ ہو لوں۔ تب مجھ پر وار کرنا۔ اس کے بعد خواجہ نے نماز شروع کی۔ رکوع کے بعد سجدہ کے لئے سر زمین پر رکھا۔ دو دفعہ سبحان ربی الاعلیٰ کا ورد کیا۔ تیسری بار "سبحان" کا لفظ زبان پر تھا۔ کہ شیر خاں نے تلوار مار کر سر تن سے جدا کر دیا۔

لگایا تھا مالی نے اک باغ ایسا
نہ تھا جس میں چھوٹا بڑا کوئی پودا

باغی پروانے

"وزیر اعظم نے سجدے سے سر اٹھا کر اپنے آنسو پونچھے اور قبرستان شاہی کی طرف نظریں جماتے ہوئے کہا:
"پیارے بھائی نوکر کے لئے بڑے سے بڑا مرتبہ وکالت اور وزارت کا ہے - وہ ہمیں مل چکا - نوبت شاہی کے ساتھ ہماری جو عزت افزائی ہوئی - یہ اس سلسلہ کی آخری کڑی تھی - ہمارا کمال ختم ہو چکا - اب زوال کا آغاز یقینی ہے - اس کے تصور میں میری جہاندیدہ نگاہیں اشکبار ہیں - آؤ تم بھی اپنی نشیلی آنکھوں سے چند گرم گرم قطرے گراؤ - خدا معلوم کل کو ہمارا کیا حشر ہو"
"احمد خاں"

سحر مے گفت بلبل باغباں را
دریں گل جز نہالِ غم نگیرد
بہ پیری مے رسد خارِ بیاباں
ولے گل چوں جواں گیرد بمیرد

شخصی حکومتوں میں جب کسی وزیر یا امیر کا درجہ بادشاہ سے بڑھنے لگتا ہے۔ تو اس وقت غیرت یا مصلحت ملکی سے بادشاہ اس خاندان کے درپے آزار ہو جاتا ہے

(۱)

احمد خاں سلے زئی افغان کا خاندان عرصہ تیس سال سے احمد پور شرقیہ (ریاست بہاول پور) میں سکونت پذیر تھا۔ ۱۹۳۰ء میں جب وہ پہلی بار شیر خاں سلے زئی کے ہمراہ یہاں آیا تھا۔ تو وقتی ضرورت کے پیشِ نظر شہر کے ایک گوشہ میں چند مکانات

تعمیر کرا لئے تھے ۔ مگر اب یہ حصہ سلے زئی افاغنہ کے محلات سے پٹا پڑا تھا ۔ درمیان میں ایک مسجد اور عالیشان بنگلہ دائیں بائیں غلام محمد خان، محمد یار خان اور تاج محمد خان کے خوبصورت محلات تھے۔
سردار احمد خان نے ۱۹۵۳ء سے جبکہ وہ بخت کی یاوری سے سلطنت عباسیہ کے مدار المہام مقرر ہوئے تھے ۔ اپنی رہائش مستقل طور پر اپنے نو تعمیر محل ڈیرہ مبارک میں رکھ لی تھی ۔
شہر میں اپنے محلہ کے اندر جو کٹرہ احمد خاں کے نام سے مشہور ہو گیا تھا ۔ ہر جمعہ کو تشریف لایا کرتے تھے ۔ اپنی تعمیر کردہ مسجد میں جمعہ ادا کرتے ۔ دینیات کے طلباء سے پُر لطف سوال و جواب ہوتے ۔ انہیں انعام سے نوازتے ۔ پھر اپنے بنگلہ میں چلے جاتے ۔ جہاں عصر تک سلے زئی افاغنہ سے تبادلہ خیالات ہوتا رہتا ۔ شام کو واپسی ہوتی ۔
یوں تو سلے زئی خاندان کا ہر بچہ شجاع تھا ۔ مگر غلام محمد خان کے دیکھنے سے بابر و اکبر کی یاد تازہ ہوتی تھی ۔ گندمی رنگ ۔ دراز قد ۔ گول چہرہ، موٹی موٹی سیاہ اور چمکیلی آنکھیں ۔ دراز پلکیں ۔ بلند پیشانی ۔ بڑی بڑی سیاہ مونچھیں ۔ سُتواں ناک ۔ پتلے پتلے یاقوتی ہونٹ، چوڑا سینہ ۔ بھرے بھرے بازو ۔ چست شیر شاہی جسم ۔

جلال و جمال کی حسین تصویر اور شجاعت و بسالت کا زندہ پیکر تھا۔ احمدؔ خاں کا دوسرا بھائی محمدؔ یار خاں بھی مردانہ حُسن کا مکمل نمونہ تھا۔ احمدؔ خاں ریاست کے کاروبار میں مصروف رہتا۔ غلام محمدؐ خاں ایک سپاہی تھا۔ اور تلوار چلانے کے لئے ہر وقت بے تاب رہتا تھا۔ محمد یار خاں کو گھر کے تمام معاملات تفویض تھے۔ چنانچہ اگر ناصر خاں کو اپنے بستے کے لئے تاگے کی ضرورت پڑتی۔ تو وہ بھی اسی چچے سے آکر مانگتا۔ جب تینوں بھائی گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے۔ تو ایک دنیا ان کے جاہ و جلال کا تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتی۔

۲

۱۸۵۸ء میں نواب فتح خاں کا انتقال ہو گیا۔ اور صاحبزادہ رحیم یار خاں نے نواب محمد بہاول خاں رابع کے لقب سے موروثی تخت پر جلوس کیا۔ خان پور اور الہ آباد کے داؤد پوترے جو حکومت کی تعمیر و تخریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے انہوں نے نواب کے چھوٹے بھائی صاحبزادہ گل محمد خاں کو بادشاہت کے سبز باغ دکھانے شروع کئے۔ وہ شامت کا مارا بھی ان کے چکمے میں آگیا۔ احمدؔ خاں وکیل السلطنت نے اپنے شیر دل

بھائی غلام محمد خان کو اس مہم پر روانہ کیا۔ جس نے معمولی سی جھڑپ کے بعد باغی شہزادے کو گرفتار کر لیا۔

نواب صاحب اس وقت قلعہ ڈیراور میں تشریف رکھتے تھے۔ سردار احمد خاں نے مجرم کو پیش کیا۔ سرکار بہاول پور غلام محمد خاں کے اس کارنامے سے اس قدر مسرور ہوئی۔ کہ بے اختیار گلے سے لگا لیا۔ اور وزیر پر یہ عنایت ہوئی۔ کہ نوبت شاہی کے ساتھ اس کی نوبت بھی بجائی گئی۔

قلعہ ڈیراور کے پرشکوہ دروازے پر احمد خاں کی نوبت بج رہی تھی۔ تمام افغان فرط مسرت سے جھوم رہے تھے غلام محمد خاں بھائی کو مبارک باد دینے کے لئے خیمہ میں داخل ہوا۔ مگر یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وزیر اعظم سجدے میں سر رکھے سسکیاں لے رہے ہیں۔

غلام محمد خاں نے خیال کیا۔ شاید "ادائے شکر" کی صورت ہے۔ اس لئے خاموشی سے غالیچے پر بیٹھ گیا۔ وزیر اعظم نے سجدے سے سر اٹھا کر اپنے آنسو پونچھے۔ اور قبرستان شاہی کی طرف نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"پیارے بھائی! نوکر کے لئے بڑے سے بڑا مرتبہ وکالت

اور وزارت کا ہے - وہ ہمیں مِل چکا - نوبت شاہی کے ساتھ ہماری جو عزت افزائی ہوئی یہ اس سلسلہ کی آخری کڑی تھی - ہمارا کمال ختم ہو چکا اب زوال کا آغاز یقینی ہے - اس کے تصور میں میری جہاں دیدہ نگاہیں اشکبار ہیں - آؤ تم بھی اپنی نشیلی آنکھوں سے چند گرم قطرے گراؤ - خدا معلوم کل کو ہمارا کیا حشر ہو" - یہ کہہ کر وزیر اعظم کسی گہری سوچ میں پڑ گیا - اس کی نگاہیں برابر قبرستان سے ٹکرا رہی تھیں - چہرے سے حسرت و یاس برستی نظر آ رہی تھی - تیوریوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ دنیا بھر کی حکمت و فراست ان میں سمٹ کر آ گئی ہے -

غلام محمد خاں نے یہ سب کچھ دیکھ کر بے پرواہی سے جواب دیا - بھیّا - اگر مشیّت ایزدی کو یہی منظور ہے تو ہمارے آنسو مستقبل کی المناکیوں کو روک نہیں سکتے - ہم نے جس جاہ جلال سے اقبال کے چند روز بسر کئے ہیں - ان کا تقاضا یہ ہے کہ بربادی پر عورتوں کی طرح آنسو نہ بہائیں - بلکہ اسے بھی پر شوکت طریقے سے انجام کو پہنچائیں - نصیر خاں گور گیج کے خاندان کا انجام ہمارے سامنے ہے - احمد پور ٹاؤن کی طرح انہیں نگل گیا - آج شاہ شمس کا قبرستان ان کی قبریں دکھانے سے بھی عاجز ہے - چمنستان بہاول پور کے اس گلِ رعنا نے کسی نامعلوم خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے کہا - مگر ان بہادروں کا نام اُن کے غیر فانی کارناموں

کے سبب زندہ ہے۔ نصیر خاں ختم ہو چکا۔ لیکن بہاول پور کے سیاسی ماحول میں اس کا اثر اب تک کار فرما ہے ؎

نظر فسانۂ گل ختم ہو چکا لیکن!
تیرے لبوں پہ حدیثِ بہار ہے اب تک

"ہاں تم درست کہتے ہو" احمد خاں نے درباری لباس پہنتے ہوئے کہا ہم سب ملکِ عدم کے مسافر ہیں۔ ہمیں اس سفر کے لئے ہر وقت کمربستہ رہنا چاہیئے۔ یہ کہہ کر دونو بھائی دارالامارہ کو روانہ ہوئے۔

(۲)

سردار احمد خاں کو جس امر کا کھٹکا تھا وہ آخر ہو کے رہا۔ اس واقعہ کو چند یوم ہی گذرے تھے کہ ملے زئی افاغنہ کے اقبال کا نیرِ اعظم جو اب تک بڑی آب و تاب سے نصف النہار پہ چمک رہا تھا۔ غروب ہونے کے لئے نیچے ڈھلنے لگا۔ بات یہ ہوئی کہ جب داؤد پوتروں کی سازش کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ پڑا تو وہ احمد خاں کے سخت مخالف ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ جب تک یہ شخص وزیر ہے ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکتی، اس لئے سرکار بہاول پور سے پہلے اسے ٹھکانے لگانا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے حشرات الارض کی طرح اپنے ایجنٹ اس غرض کے لئے چھوڑ دیئے۔ کہ خلوت اور جلوت میں جہاں موقع پائیں نواب صاحب کو وزیر کی طرف سے

بدگمان کر دیں ۔ اتفاق سے گل محمد خاں کی بغاوت میں سید کرم شاہ نامی ایک ایسا شخص بھی شامل تھا جو کبھی یار محمد خاں کا ملازم رہ چکا تھا۔ دشمنوں کے لئے اتنی سی بات کافی تھی۔ معز الدین اور شیر شاہ نے سرکار کو بڑے وثوق سے یقین دلایا کہ سازش کا اصلی بانی آپ کا وزیر ہی ہے۔ چونکہ فقیر سراج الدین کا واقعہ پہلے پیش آچکا تھا۔ اس لئے نواب صاحب کو احمد خاں کے متعلق شکوک پیدا ہو گئے۔ غضب یہ ہوا کہ چند ایام کے بعد گل محمد خاں قلعہ ڈیرا در سے نکل بھاگا۔ مخالفوں نے کہا حضور سرکار۔ یہ سب کچھ آپ کے محبوب وزیر کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ درباری مشیروں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آقا کا دل اپنے نمک حلال وزیر سے منحرف ہو گیا۔ احمد خان بھی دربار کے حالات سے بے خبر نہ تھا۔ اس نے خیال کیا۔ کہ سازش کا الزام اسی صورت میں ہی رفع ہو سکتا ہے کہ ہم گل محمد خاں کو دوبارہ گرفتار کر کے سرکار کی خدمت میں پیش کریں۔ چنانچہ غلام محمد خاں اسی مہم پر روانہ ہوا۔ اور اس نے بدستور سابق اپنی بہادری اور جوانمردی سے گل محمد خاں کو گرفتار کر لیا۔ وزیر اعظم باغی کو لے کر حضور میں حاضر ہوا اور عرض کی۔

یہ غلام کس لائق تھا۔ جہاں پناہ کے قبلہ گاہ نے اسے نوازا۔ اور فرش خاک سے اٹھا کر اوجِ ثریا پر پہنچا دیا۔ اس سے بڑا مرتبہ نوکر کے لئے نہیں ہو سکتا۔ اب اگر یہ غلام پیرانہ سالی میں نمک حرامی کا داغ پیشانی پر لگا کر کسی

دوسرے کے لیے بادشاہی کی جدوجہد کرے تو وہ بھی وزارت عظمیٰ سے بڑا مرتبہ نہیں دے سکتا۔

اے عالم پناہ! میں سن رہا ہوں کہ دشمن مجھے اس سازش میں ملوث کر رہے ہیں۔ میرے جواں ہمت بھائی نے دوسری مرتبہ اس باغی شہزادے کو گرفتار کر کے حضور میں پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ بندہ خود بھی حاضر ہے۔ اگر فدوی کے اخلاص پر کسی قسم کا شبہ ہے تو یہ سر ہے اور یہ تلوار۔ مجھے شہادت سے سرافراز کر کے ہر قسم کے خدشے سے محفوظ ہو جائیے۔ ورنہ ان بدباطن اُمراء کو دربار سے نکال دیجیے، جو اس قسم کی بے سروپا باتیں کر کے خاطرِ عاطر کو غلام کی طرف سے مکدر کر رہے ہیں۔

اقبال مند نواب نے گل محمد خاں کو تو قید کر دیا۔ اور غلام محمد خاں کو خلعتِ فاخرہ اور طلائی کنگن انعام میں مرحمت فرمائے۔ وزیر سے ارشاد ہوا کہ تمہاری تقریر سے ہوا خواہی ٹپکتی ہے۔ تمہارے کارنامے ہی تمہاری اخلاص مندی کے شاہد ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ جو شکوک اور شبہات آپ کے اور آپ کے خاندان کے متعلق پیدا ہو گئے ہیں۔ انہیں دل سے نکال دوں۔ یہ کہہ کر تلوار اٹھا کر وزیر کو واپس دے دی۔ اور فرمایا کہ بدباطن امرا کا دربار میں رہنا ہمیں بھی پسند نہیں۔ جب تک حکومت کے آپ وکیلِ مطلق ہیں۔ ایسے امراء کے اخراج کی آپ کو ہر وقت اجازت ہے۔ احمد خانی

اداے شکر کے لئے جھک گیا۔ اور عرض کیا۔

"معزالدین خاں اور شیر شاہ عرصہ سے فتنہ و فساد کی خاموش چنگاریوں کو ہوا دے رہے ہیں۔ سرِدست اُن کا نکالنا مطلوب ہے۔"

"بہتر" نواب صاحب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ احمد خاں اور غلام محمد خاں دو و ؟ خصتی کرتے ہوئے رخصت ہوئے +

(۳)

دوسرے دن شیر شاہ کو ملازمت سے جواب دے دیا گیا۔ اور معزالدین کو سرکاری کارندے دریا سے پار پہنچا آئے۔ حکومت کے بدخواہوں نے اب وزیر اعظم کے خلاف جھوٹی عرضیاں بھیجنی شروع کیں۔ ریتی سے میکلوڈ روڈ تک پڑھے لکھے آدمی پھیلا دئے گئے جن کا کام وزیر اعظم اور اس کے خاندان کے خلاف سرکار عالی کی خدمت میں بے اصل درخواستیں بھیجنا تھا، درباریں اور آدمی بھرتی ہوئے۔ محل سرائے سلطانی میں بے شمار آدمی اس کام پر مقرر ہوئے کہ جب اور جہاں موقع پائیں احمد خاں کے خلاف مظالم اور استبداد کے قصے اس طرح گھڑ گھڑ کر بیان کریں کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اس منظم سازش کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرکار عالی کی میز پر روزمرہ جو ڈاک رکھی جاتی وہ تمام و کمال ملے زئی افاغنہ کی شکایات پر مشتمل ہوتی۔ محلسرائے میں بیگمات اور خادماؤں سے سابقہ پڑتا۔ تو

وہاں بھی یہی مذکور ہوتا۔ آخر سنتے سنتے سرکار کے کان پک گئے۔ سرکار بہاول پور نے جن لوگوں کو وزیر اعظم کی حرکات و سکنات پر نگران مقرر کیا انہوں نے اور حاشیہ آرائی کی۔ ستم یہ ہوا کہ ڈکیتی مراسلوں کے سلسلہ میں سرکار نے خود جو تحقیقات کی اس میں بھی بدخواہوں کی سازش کام کر گئی اور نواب صاحب کو اگر پہلے وزیر کے اخلاص پر شبہ تھا تو اب یقین ہو گیا۔ غلام محمد کو پل پل کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اس نے بھائی کو کہا کہ حالات ناساعد ہوتے جا رہے ہیں۔ ممکن ہے نصیر خاں گورگیج کی طرح ہم بھی عتاب شاہی کا شکار ہو جائیں۔ بہتر ہے کہ سامان اور بال بچوں کو دریا پار اپنی جاگیر میں پہنچا دیں۔ احمد خاں نے کہا اس وقت ریاست میں سرکار کے بدخواہوں کی کثرت ہے یہ لوگ طرح طرح سے ہمارے آقا کو ہماری طرف سے بدگمان کر رہے ہیں اگر ہم نے اپنے سامان کو دریا کے پار بھیجدیا تو مخالفوں کو ہمارے خلاف کہنے سننے کا اور موقع ملجائے گا۔ نمک حلالی کا تقاضا یہی ہے کہ خاموشی سے اپنی بربادی کا تماشا دیکھا کریں اور زبان سے اُف تک نہ کریں، اس پر غلام محمد خاں راضی برضا ہو کر رہ گیا۔

(۴)

انہی ایام میں نواب صاحب پر جیونہ نامی کلاونت کا جادو چل رہا تھا کیونکہ یہ شخص فنِ موسیقی کا ماہر تھا۔ اور شکل و صورت بھی اچھی رکھتا تھا،

اِس لئے سرکار بہاول پور کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ ایک موقع پر سرکار نے خوش ہو کر فرمایا۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔ کہا فوج کے کسی دستہ کا افسر بنا دیجیے۔ اسی وقت وزیر کے نام حکم آیا۔ کہ جیونہ کو فوج کا افسر بنا دیا جائے دانا وزیر نے خیال کیا۔ کہ اگر اس کلاونت کو سادات۔ قریش۔ بلوچ پر افسر مقرر کرتا ہوں تو غدر برپا ہو جائیگا۔ اگر انکار کرتا ہوں تو سرکار کو خدا معلوم کیا کیا بھڑکائیگا۔ اس لئے حکمنامہ کو سر آنکھوں سے لگا کر جیب میں ڈال لیا۔ کہا۔ میاں جیونہ دس بارہ دن ٹھہرو۔ آپ کا کام ہو جائیگا۔ اس کم ظرف سے صبر نہ ہو سکا۔ دوسرے دن پھر آدھمکا۔ وزیر صاحب نے بڑے حوصلے سے پھر وہی جواب دیا۔ اس نے کہا کہ دس بارہ دنوں کی تاخیر کیا معنی رکھتی ہے سرکار عالی کے حکم کی فوراً تعمیل ہونی چاہیئے۔

فرمایا۔ میاں جیونہ۔ ملکداری کا کام بہت مشکل ہے۔ تم جانتے ہو کہ فوج میں سید۔ قریشی اور پٹھان سپاہی ملازم ہیں۔ وہ تمہاری ماتحتی میں لڑنا مرنا کبھی گوارا نہیں کرینگے میں مراسیوں کی ایک فوج بنا رہا ہوں۔ جب وہ تیار ہو جائے گی تمہیں اس کا افسر بنا دونگا۔"

جیونہ غضبناک ہو کر چلا گیا۔ اور سرکار عالی سے جا کر کہا۔ کہ سلطنت آپ کی ہے یا احمد خاں کی ہے؟ اور ساتھ ہی وہ پروانہ جو وزیر صاحب سے واپس حاصل کر لیا تھا۔ سرکار کے آگے پھینک دیا۔

اسی طرح آغا اقبال نامی ایک مخنث نے بھی سرکار عالی سے فوج کے ایک دستے پر افسری کا پروانہ حاصل کرلیا۔ مگر وزیر اعظم نے حیوبہ کی طرح اسے بھی ناکام پھیرا۔ یہ شخص شاہ شجاع کے ہمراہیوں میں سے تھا۔ سرکار کو اس کی خاطر مطلوب تھی۔ اِن دونوں واقعات کا سرکار کے دل پر بہت اثر پڑا۔ اور کدورت روز بروز بڑھتی گئی۔ ایک دن نواب صاحب نے حیات محمد خاں دربان کے ذریعے وزیر صاحب کی خدمت میں دو تین کام کہلا بھیجے۔ احمد خاں نے ان میں سے ایک کام بھی نہ کیا۔ دربان نے واپس جاکر ایسی ایسی ملائم باتیں وزیر کی طرف سے گھڑ کر سنائیں کہ نواب صاحب کا پیمانۂ غضب لبریز ہوگیا۔

(۵)

اِن دنوں گدڑوالہ کے نواح میں شورش پسند امراء جمع ہو رہے تھے۔ وزیر اعظم کو رپورٹ پہنچی تو اس نے اپنے شیر دل بھائی غلام محمد خاں کو فوج کے ایک دستہ کے ساتھ اس طرف روانہ کردیا۔ تاکہ ان کی نقل و حرکت پر کڑی نگرانی رکھے۔ خان مذکور ۲۵ یوم گدڑوالے میں خیمہ زن رہا۔ اس سے فتنہ پرداز امراء مرعوب ہوکر اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے۔ اسی اثناء میں کسی نے آکر اطلاع دی کہ چھینلی کے جنگل میں کہیں سے شیر آگیا ہے اور اس نے مضافات کے کئی آدمی اور جانور مار ڈالے ہیں۔ دوسرے دن خان کے والد کی برسی تھی اور اس کا احمد پور میں پہنچنا نہایت ضروری تھا۔ مگر اس کی حمیت نے گوارا نہ کیا،

کہ اس طرح خلقِ خدا کا خون ہوتا دیکھے اور چشم پوشی کر کے چلا جائے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ آج رات کو شیر کا خاتمہ کر کے صبح سویرے نماز اپنے بھائی کے ساتھ جا کر ادا کرے۔ یہ عزم اس کے لئے کوئی نیا نہیں تھا۔ اس کی زندگی میں ایسے ہزاروں واقعے گذر چکے تھے۔ چنانچہ اس نے فوج اور سامان کو تواحیہ پور کی طرف روانہ کردیا۔ اور خود شکاری لباس زیب تن کر کے اپنے جاں نثار غلام بہادر اکے ہمراہ چھنیلی کو روانہ ہوگیا۔

(۶)

۲۴ مئی سنہ ۱۸۶۱ء کی رات بھی کتنی بھیانک تھی۔ چاروں طرف اندھیرے کا بے پناہ سیلاب ایک خوفناک سی وحشت پیدا کر رہا تھا۔ قدم قدم پر ٹھوکریں اور بادِ مخالف کے جھونکے سہتے دونو سوار ہوا میں اُڑے جا رہے تھے۔ گوٹھ چنی کے آگے راستہ خراب تھا۔ گھوڑے بھٹک بھٹک کر ریت میں کھُبنے لگے اگرچہ دونو شکاری آبادی سے بچ بچ کر چل رہے تھے۔ مگر پھر بھی کہیں کہیں کتوں سے سامنا ہو جاتا تھا۔ کوئی آدھی رات کا عمل ہوگا کہ خاں نے گھوڑے کو روکا اور کہا

بہادر! ہم منزلِ مقصود پر آگئے۔ یہاں سے گھوڑوں کو لیکر آہستہ آہستہ چلنا ہوگا۔ بندوق سنبھال کر رکھو۔ ہم شیر کے مارنے کیلئے آئے ہیں۔ رات کی تاریکی میں اس کی آنکھوں پر ہی نشانہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ یاد رکھو۔ بندوق ہمیں اپنی حفاظت کے لئے دی گئی ہے۔ شیر پر فیر کرنے کے لئے نہیں

(۷)

تھوڑی دور چلے تھے کہ شیر کے گرجنے کی آواز آئی۔ خان جست لگا کر گھوڑے سے کود پڑا۔ اور بولا۔ دیکھو بہادر! جنگل کا بادشاہ نئے گوشت کی بو پاکر دھاڑ رہا ہے۔ تم گھوڑوں کو تھامو۔ میں اپنے شکار کا استقبال کرتا ہوں۔ خان بندوق ہاتھ میں لئے آہستہ آہستہ روانہ ہوا۔ شیر گرجتا۔ دھاڑتا چلا آرہا تھا اس کی روشن آنکھیں مہیب انداز میں صاف طور پر چمکتی دکھائی دے رہی تھیں خان نے نشانہ باندھ کر بندوق کی لبلبی کو دبایا۔ جنگل کی فضا گونج اٹھی۔ شیر گرج کر لپکا۔ مگر نشانہ اتنا کاری پڑا تھا کہ آتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ چند لمحات تک منہ سے صدائے عفیف نکالتا اور درد و کرب سے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ جھنیلی کے ماحول میں ہولناک کپکپاہٹ سی پیدا ہوئی۔ اور جنگلی پرندے خوف سے پھڑپھڑانے لگے۔ اب بہادر بھی قریب آچکا تھا۔ اس نے آگ جلائی۔ خان نے روشنی میں شیر کے بھاری بھرکم لاشے کو دیکھ کر کہا۔ چھوڑ دو بیٹا۔ اسے اُٹھانے کی کوشش نہ کرو۔ دونو واپس لوٹے۔ گھوڑے خوف کے مارے پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ خان نے تھپکی دی اور پیار سے چمکارا۔ گھوڑا ہنہنایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مالک کے اس کارنامے پر مبارکباد دے رہا ہے۔ خان اُچک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اور ۳۶ میلوں کی منزل کاٹ ابھی محلے کی مسجد میں اذان نہ ہوئی تھی کہ گھر جا پہنچا۔

(۸)

صبح سویرے محمد جبار کی زبانی یہ سُنکر غلام محمد خاں دم بخود رہگیا کہ جس شر کا یہ خاتمہ کر کے آیا ہے۔ اس کے شکار کا پروگرام بن چکا تھا۔ اور آج علی الصبح سرکار عالی نے چہار اسپہ فٹن پر تشریف لیجانا ہے۔ غلام محمد خاں بے تحاشا گھوڑے پر سوار ہوکر ڈیرہ مبارک پہنچا۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہوا۔ کہ سرکار یہاں سے کوئی دو گھنٹہ رات لے کر روانہ ہو چکی ہے۔ خاں کے پاؤں مَن مَن کے ہو گئے۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بھائی کے پاس جاکر ساری کیفیت من وعن بیان کر دی۔ وزیر اعظم نے کہا بہت برا ہوا۔ مگر اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر اس پر بھی گرفت ہوتی ہے تو یہ امر الٰہی ہے، اس سے سفر کا کوئی چارہ نہیں۔ جاؤ گھر میں بیٹھ کر خداوند عالم سے اپنی اور اپنے خاندان کے لئے بہتری کی دعا مانگو۔ میں بھی مصروفِ دعا ہوتا ہوں۔

(۹)

دوسرے دن ۲۵ مئی کے سات بجے بہرام خاں کوتوال نے سرکار عالی کا یہ فرمان آکر پیش کیا۔ احمد خان وزیر اعظم بہاول پور! بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر آپکو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا ہے۔ مناسب ہے کہ آپ عیال و اطفال کو ہمراہ لے کر ۲۴ گھنٹوں کے اندر دریا سے پار چلے جائیں"۔ بوڑھے وزیر نے بڑے حوصلے سے پروانہ کو ملاحظہ کیا۔ اور کہا۔ مالک کی رضا پر نوکر راضی ہے۔ اگر

بار برداری کا انتظام ہو جائے تو غلام الٰہی اِس سرزمین کو الوداع کہنے کے لئے تیار ہے۔ کوتوال یہ جواب لے کر محلسرائے سلطانی کو روانہ ہوا۔ اور وزیر پروانۂ شاہی کو ہاتھ میں لے کر اُٹھا تاکہ کسی ملازم کو بھائیوں کے پاس روانہ کرے یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ محل کے چاروں طرف پولیس نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ ملازم غائب تھے۔ صرف خیرو کہار زنانخانے کی ڈیوڑھی پر بیٹھا نظر پڑا۔ اُسے اشارے سے بلا کر کہا

بیٹا سرکار نے ہمیں نوکری سے ہٹا دیا ہے۔ ۲۴ گھنٹوں کے اندر ریاست سے نکل جانے کا حکم ہے۔ فوراً احمد پور جاکر میرے بھائیوں کو اِطلاع کرو۔

(۱۰)

غلام محمد خاں اپنے افراد کے ساتھ بنگلے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ خیرو اُڑتا ہوا آیا۔ اور چیخ کر قدموں میں گر گیا۔ غلام محمد خاں نے ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"خیرو! خیر تو ہے"؟

کوئی خیر نہیں ہے۔ میرے آقا۔ غضب ہو گیا۔ وزیر صاحب نوکری سے ہٹا دئے گئے۔ محل پر شاہی پہرہ ہے۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں میں زنانخانے کی ڈیوڑھی پر دم بخود یہ تماشا دیکھتا تھا۔ کہ وزیر صاحب نے بلا کر کہا

کھڑے کیا دیکھتے ہو۔ دوڑ کر میرے بھائیوں کو اطلاع دو۔

غلام محمد خاں کا چہرہ یہ خبر سُنکر سُرخ ہو گیا۔ آنکھوں کی پُتلیاں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔ چلا کر کہا۔ کیا ہم ذلیل ہو کر اس مُلک سے نکلیں۔ آخر کیوں؟ محض اس وجہ سے۔ کہ ایک شیر کیوں مار ڈالا۔ کیا ہماری ۲۰ سالہ خدمات پر پانی پھیر دیا گیا۔ محمد یار خاں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ بھائی! برادری کے تمام نبرد آزما بہادروں کو بُلا لو۔ اگر سرکار ہمارے خون سے اس سرزمین کو لالہ زار بنانا چاہتی ہے تو بسم اللہ۔ جس شخص کو خدا نے سربلند پیدا کیا ہے وہ کسی حالت میں سرنگوں نہیں ہو سکتا۔ جان جائے گی مگر آن نہیں ؎

اللہ کے مردوں کو آتی نہیں روباہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی

دونوں بھائی مرنے مارنے پر کمربستہ ہو گئے۔ اندر حرم سرا میں پہلے سے خادمہ عورتوں نے اطلاع دے دی تھی۔ سہمی ہوئی غم انگیز شکلیں۔ اور حسرت و یاس میں اُلجھے ہوئے چند چہرے اپنے مردوں کی انتظار میں چشم براہ بیٹھے تھے۔ سب کو جمع کر کے کہا۔

امرِ واقعہ تم پر مخفی نہیں رہا۔ موت کا پیالہ ہر شخص نے پینا ہے۔ خواہ آج خواہ کل۔ ہماری موت کا وقت قریب آ پہنچا۔ ہمارا واپس آنا محال ہے ممکن ہے کہ تم ہمیں پھر نہ دیکھ سکو۔ اس لئے تم سب کو افغانی غیرت کی قسم دے کر

کہتا ہوں کہ اگر تم دیکھو کہ عزت بچتی نظر نہیں آتی تو تلواریں گھر میں پڑی ہیں۔ ان سے ایک دوسرے کا خاتمہ کر دینا۔"

سب نے رو کر کہا۔ اگر یہی صورتِ حال ہے تو پھر پہلے ہمارا کام تمام کرو، پھر ڈیرہ مبارک کو جاؤ۔ مگر خان نے کہا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ خود کشی ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ جس طرح کربلا کے میدان میں امام مظلوم کی مستورات نے صبر کیا تھا تم بھی اسی طرح سختیاں سہو۔ مگر عزت پر آنچ نہ آنے دو۔"

یہ کہہ کر دونو بھائیوں نے غسل کر کے کپڑے بدلے۔ عطر لگایا۔ اور تلوار بندوق سے لیس ہو کر باہر نکل آئے۔ خاندان کے اعزہ و اقارب بھی حقِ نمک ادا کرنے کو جمع تھے۔ غلام محمد خاں نے کہا ہم تو مرنے جا رہے ہیں تم کیوں جان گنواتے ہو

اے ہمنفساں آتشم از من بگریزید
آنکس کہ شود ہمرہ من دشمنِ خویش است

تاج محمد خاں نے کہا۔ عمر بھر آپ لوگوں کے سائے میں پرورش پائی ہے آپ کے بعد ہمارا جینا ▪ جینا بے اثر ہے۔ جدھر تم جاؤ گے ہمیں بھی ساتھ پاؤ گے۔ محمد رمان خاں۔ حیات اللہ خاں۔ سردار خاں۔ غلام قادر خاں صالح محمد خاں بادوزئی۔ محمد نواز خاں۔ محمد خاں یسمند خاں قصوریہ۔ نواز خاں۔ سید پیر شاہ

سید مہر شاہ۔ ہوت بلوچ۔ غلام علی خاں۔ حفیظ اللہ خاں وغیرہ بھی فوجی لباس پہن کر بندوق کندھے پر رکھ ساتھ ہو لئے۔

۱۱

سرکار نے ملا ابراہیم کوتوال کو وزیر کے محل کی نگرانی کے لئے مقرر کیا اور عبدالکریم خاں وجمعیت رائے دختر مستوفی کے نام حکم بھیجا کہ قلعہ میں حاضر ہو کر حساب کتاب کی فہمید کریں۔

عبدالکریم خاں وزیر اعظم کا معتمد تھا۔ نواب صادق محمد خاں ثالث کو رپورٹ پہنچی تھی۔ کہ یہ شخص سرکار پر جادو کیا کرتا ہے۔ سرکار نے اس کے سامنے کے دو دانت توڑ دئے۔ اور مچھلی وسیاہ تیل پلایا تاکہ اس کا جادو کارگر نہ ہو۔ سرکار سے طلبی کا فرمان پہنچا۔ تو اس نے کہا کہ مجھے سرکار عالی کے حضور میں جانے سے انکار نہیں۔ مگر پہلے خداوند نعمت سے مل لینے دو انہوں نے اپنی طرف کھینچا۔ عبدالکریم خاں نے اپنا دامن چھڑانے کی کوشش کی۔ اسی دار وگیر میں اس کے کپڑے پھٹ گئے۔ یہ غصہ میں جھلّا اٹھا۔ اور سپاہی کو تھپڑ مارا۔ انہوں نے سنگینوں پر دھر لیا۔ چنانچہ محلِ شاہی تک جاتے ملکِ عدم کو رخصت ہو گیا۔

(۱۲)

غلام محمد خاں اور اس کے جاں نثار رفقا گھوڑوں پر سوار ہو کر بڑے

تمکنت اور وقار کے ساتھ سر سے پاؤں تک اوپچی بنے آ رہے تھے۔ عربی گھوڑے رقص کرتے اور ہنہناتے چلے آتے تھے۔ جب قلعہ معلےٰ کے قریب پہنچے۔ عبدالکریم خاں کی لاش نظر آئی۔ بے ساختہ چلا کر کہا۔

محمد یار خاں دیکھتے ہو؟ پہل سرکار کی طرف سے ہوئی سامنے ملا ابراہیم کوتوال، مخدوم راجن بخش، گویا انتظار میں کھڑے تھے دیکھ کر آگے بڑھے اور کہا۔ وزیر صاحب محل میں نظر بند ہیں۔ سرکار کی اجازت کے بغیر آپ اُن سے نہیں مل سکتے۔

کیا ہم بھائی سے ملنے کے لئے بھی اجازت حاصل کریں۔ غلام محمد خاں نے حیران ہو کر بھائی کے منہ کی طرف دیکھا۔ محمد یار خاں نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ دونوں نے یکبارگی گھوڑوں کو جو ایڑ لگائی اُن کی زد سے نکل گئے۔ ملا ابراہیم نے جو فیر کیا خاں کا ملازم زخمی ہو کر گر پڑا۔ پیچھے جو جاں نثار آ رہے تھے۔ انہوں نے بیک وقت باڑھ لگائی۔ ملا ابراہیم مر گیا اور مخدوم حسن بخش بری طرح زخمی ہوا۔ اس طرح خاں کے آدمیوں نے قصاص کا بدلہ قصاص میں لے لیا۔ وزیر اعظم کے دروازے پر پہنچے تو وہاں سرکار کا خاص ملازم کریم بخش رائفل ہاتھ میں لئے پہرے پر موجود پایا۔ اس نے اندر داخل ہونے سے روکا۔ جس پر خاں کے جاں باز بہادر نے اُسے بھی بندوق سے ختم کر ڈالا۔ اندر داخل ہو کر دیکھا کہ ۷۰ برس کا بوڑھا وزیر تخت پر مصلیٰ بچھائے قرآن مجید

کی تلاوت میں مصروف ہے۔ بھائی کو زندہ دیکھ کر خاں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ احمد خاں نے قرآن مجید کو بند کرتے ہوئے سب صاحبان کو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ غلام محمد خاں نے راستے کے حادثات کا ذکر کیا۔ فرمایا مالک سے مقابل ہوتا ہم جیسے مخلص غلاموں کو مناسب نہیں۔ ہم انتہائی نیازمندی سے قرآنِ مجید کو سفارشی بنا کر بھیجیں گے، سرکار ضرور معاف کر دے گی۔ غلام محمد نے جوش میں آکر کہا۔ بھائی صاحب اب ایسی توقعات کو رہنے دیجئے۔ ہم حرام موت مرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں۔ لڑینگے اور مردانہ وار لڑینگے تاکہ جب مؤرخ بہاولپور کی تاریخ لکھنے بیٹھے تو ہماری بہادری کے کارناموں کو آبِ زر سے لکھے

(۱۳)

نواب صاحب بھی محل میں بیٹھے پل پل کی خبریں منگوا رہے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ پٹھان عذر پر آمادہ ہیں تو فوج کا ایک دستہ ان کی گرفتاری پر تعینات کیا۔ اور توپچی کو حکم ہوا کہ ان پر گولہ باری کرے مگر پٹھانوں کی محبوبیت ایک دُنیا پر ظاہر تھی۔ ہر ایک ڈرتا تھا۔ سرکار کے پیارے وزیر ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں جب غصّہ فرو ہو جائے۔ سرکار ہم سے باز پرس کرے کہ ایسے بہادروں کو تم نے کیوں قتل کیا۔ اس لئے توپ میں بجائے گولہ اور بارود کے رائی اور بان ڈال کر چلاتے رہے

سرکار بہاول پور نے نھنے نامی توپچی کو قید سے رہا کر کے طلب کیا اور اپنے دستِ خاص سے اُس کے گلے میں کنٹھا اور ہاتھوں میں سونے کے کنگن ڈالے۔ وہ بڑے فخر اور غرور سے دمدمے پر آیا۔ پہلے خالی توپ چلائی غلام محمد خاں نے مہتابی کی شعاع پر ہی ایسا نشانہ باندھ کر فیر کیا کہ نھنا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔

سرکار کو اطلاع پہنچی تو اس نے بڑا افسوس کیا۔ رات بھر لمباری ہوتی رہی مگر کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔ صبح کو نواب صاحب خود گھوڑے پر سوار ہوئے اور فوج کی ہمت بندھانے کے لئے موقعہ پر تشریف لے آئے۔ طرفین سے خوب مقابلہ ہوا۔ احمد خاں آم کے تنے کی اوٹ میں فوج پر فیر کر رہا تھا سرکار کو مقابل پر دیکھ کر کہا یہ لیجئے گولی آتی ہے۔ سر کے کچھ بال اُڑ جائیں گے مگر آپ کو نقصان نہ پہنچے گا۔ ساتھ ہی سَن سے گولی پرواز کرتی ہوئی سرکار کے بالوں کی ایک لِٹ اُڑا کر نکل گئی۔

احمد خاں پھر بولا۔ سرکار ہمیں اپنے دشمنوں کے لئے زندہ رہنے دیجئے۔ مگر کچھ جواب نہ ملا۔ اِس پر احمد خاں نے مایوس ہو کر انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھا آٹھ پہر تک خونیں کارزار گرم رہا۔ سردار احمد خاں کے جاں نثار ایک ایک کر کے مارے گئے۔ خود سردار صاحب قرآن کریم کی تلاوت کرتے دودستی تلوار چلا رہے تھے۔ اچانک ایک گولی ایسی آئی کہ سر سے پار نکل گئی۔ بوڑھے وزیر نے اللہ اکبر

نعرہ لگایا اور گر کر جاں بحق ہو گیا۔ غلام محمد خاں اس طرح جھپٹ کر پہنچا۔ جیسے باز اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ بھائی کی لاش کو اٹھا کر اندر لے گیا اور تخت پوش پر لٹا کر اپنے کمسن بھتیجے محمد ناصر کو آواز دی۔ آؤ بیٹا اپنے باپ کی لاش کا خیال کرو۔ گھبراؤ نہیں۔ ہم بھی ابھی آئے۔ مستورات نے بڑا حوصلہ دکھایا۔ کہ کوئی نہ چیخی نہ چلائی۔ بڑی بیگم نے بڑے دل گردے سے لاش کو کپڑے سے ڈھک دیا اور محمد ناصر کو پیار سے راضی برضا ہونے کی تعلیم دینے لگی۔ غلام محمد خاں ابھی باہر نکلا ہی تھا کہ محمد یار خاں کی چیخ سنائی دی۔ اُس کے سینے میں گولی اُتر چکی وہ گھوڑے سے گرا چاہتا تھا کہ غلام محمد خاں نے لپک کر پکڑ لیا۔ نیم جان لاش کو سینے سے چمٹائے اندر لے گیا اور وزیر اعظم کے دوش بدوش سُلا دیا۔ پھر خود ننگی تلوار لے کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ سرکار عالی کے قریب پہنچ گیا، اس وقت غلام محمد خاں کا چہرہ خون آلودہ ہو چکا تھا۔ بدن کے کپڑے خون سے لت پت ہو چکے تھے۔ لوا لصاحب کو پکار کر کہا۔ سرکار عالی کب تک عذاب دو گے۔ اپنے ہاتھ سے ایک فیر کیوں نہیں کر دیتے کہ بندہ اس مخمصے نجات پائے۔ مگر نوا لصاحب پٹھانوں کی جوانمردی اور بیباکی پر اتنے حیران کھڑے تھے۔ کہ اُن کا دل ایسے بہادروں کو ختم کرنے کے لئے آمادہ نظر نہ آتا تھا اس وقت پٹھانوں کے تمام جوان کٹ چکے تھے۔ آخری سُورما بھی چند لمحوں کا

مہمان نظر آتا تھا۔ نواب صاحب نے ہاتھ کھڑا کیا کہ لڑائی موقوف کرو اور غلام محمد خاں کو زندہ میرے پاس لے آؤ۔ مگر وہ شیر اس طرح ہاتھ آنے والا کب تھا۔ برابر مقابلے کے لئے للکارتا اور شیر کی طرح ڈکارتا رہا۔ لیکن چونکہ خون کافی مقدار میں نکل چکا تھا۔ اس لئے چکرا کر گھوڑے سے نیچے گر پڑا۔ نواب صاحب دوڑ کر قریب پہنچے۔ مگر اس جانباز کا دم نکل چکا تھا۔

یہ تینوں شیر دل بھائی ڈیرہ نواب صاحب کے قریب ایک ہی قبر میں محو خواب ہیں۔ ان کا مقبرہ احمد خاں شہید کے نام سے خاص و عام میں اپنی شہرت رکھتا ہے۔ وہ کبھی کے ختم ہو چکے۔ لیکن ان کا نام ان کے بہادرانہ کارناموں کی وجہ سے ہنوز زندہ ہے اور زندہ رہے گا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را